لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

ZAHEER

۲۲۶۹
۵۔۸۱

اسلامی ہندوستانی تہذیب

اسلام کا یہ مختصر اور اوّلین قافلہ، اس ملک میں پردیسی کی طرح وارد ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کو اپنا عزیز وطن اور محبوب مسکن بنا لیتا ہے اس ملک کے اصلی باشندے اسکی محبّت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ اور ان نو واردانسانوں کی شکل میں ان کو محبّت کرنے والے بھائی، شفیق استاد، خیر خواہ حاکم، آزمودہ کار منتظم، ماہرِ فن کاریگر، اور بلند پایہ عالم و دانشور مل جاتے ہیں۔ یہ اسلامی نو آبادی، اپنی ذہنی صلاحیت، علمی تجربہ، قوّتِ ایجاد و اختراع، قوتِ عمل اور انتظامی صلاحیّت کا ایک ایک قطرہ اس سرزمین میں نچوڑ دیتی ہے۔ یہاں ترکوں کی سپہ گری و ترک تازی، مغلوں کی اُولوالعزمی، افغانوں کی غیرتِ قومی، ایرانیوں کا ذوقِ جمال و رعنائیٔ خیال، عربوں کی حقیقت پسندی اور ذوقِ سلیم، ملک کے باشندوں کی نرم خوئی اور صلح جوئی اور شعر و نغمہ و فلسفہ و تصوّف سے فطری مناسبت سے آ کر گھل مل گیا۔ ان سب مختلف (اور بعض اوقات متضاد) صفات پر اسلام کے عقیدۂ توحید کا پرتو اور اس کی عادلانہ تعلیمات کا عکس اسطرح پڑا کہ اس نے ان کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور ان کو ایک دوسرے سے شیر و شکر کر کے ایک نئی زندگی بخشی، اس کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جس کو ہم بجا طور پر "اسلامی ہندوستانی تہذیب" کہہ سکتے ہیں۔

(مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

Regd. No. L 1981 FORTNIGHTLY Phone : 22948

TAMEER-E-HAYAT

DaruluIoom Nadwatululama, Lucknow (India)

ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تاریخی اجلاس

[illegible]

بقیہ صـ ۳

[illegible]

۷ر محرم ۱۳۹۶ھ — ۱۰ر جنوری ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر:- اسحاق جلیس ندوی

جلد ۱۳ ⁂ شمارہ نمبر ۵

پندرہ روزہ
تعمیرِ حیات
لکھنؤ

فی پرچہ ۵۰ پیسے - سالانہ ۱۲ روپے

اسحٰق جلیس ندوی

نظامِ تعلیم کے دُور رس اثرات

ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ اجلاس عام میں دینی مدارس اور ممالک اسلامیہ کے نظام تعلیم پر خاص طور پر غور و خوض کیا گیا، اسلامی الفکر دانشوروں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقالے میں اس موضوع کا بہت تفصیلی جائزہ لیا گیا۔

نظام تعلیم ذہن و فکر پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا اندازہ ۱۹۳۰ء میں روس میں پیش کردہ اس نظام تعلیم سے ہو سکتا ہے۔ غیر جانبدار مبصرین اور ماہرین تعلیم نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) روسی حکومت کی پالیسی اور عمل کی بنیاد چونکہ انکار خدا کے دہریانہ نظریہ پر رکھی گئی اس لئے پہلے تو ۲۰ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کے لونا چارسکی (Luna Charki) کے اعلان کے مطابق فوراً ہی تمام مدارس سے مذہبی تعلیم بند کر کے ان کو بے دین بنا دیا گیا اور پھر جن اصولوں پر اشتراکی کارکن تیار کر لئے گئے تھے وہ یہ تھے۔

(الف) اشتراکیت پر ایمان (ب) خدا کا انکار (ج) خدا کی مقرر کردہ اخلاقی اقدار کی تبدیلی۔ چونکہ انقلابی جماعت کا ہر رکن ان جذبات کے نشہ میں چور تھا، لہٰذا مذہبی طبقہ کے خلاف اور عبادت گاہوں پر اس شدت سے سختی کی گئی جس شدت سے سرمایہ داروں پر کی گئی، خانقاہوں اور عبادت گاہوں کے اوقاف کو ضبط کر کے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ مذہبی قسم کے لوگوں کو نامعلوم تعداد میں مار دیا گیا۔

(۲) بقول سوویت ماہرین تعلیم، سوویت درسگاہیں محض تعلیم برائے تعلیم کے اصولوں پر مطمئن نہیں بلکہ ان کا عین منشا یہ ہے کہ وہ نئی نسل کی دماغوں میں کمیونزم کے اصول اتار دیں۔ کارل مارکس اور لینن کے متحدہ انداز فکر پر ایک عالمگیر رجحان پیدا کریں۔

(۳) کمیونسٹ روسی نظام تعلیم اپنے عوام کو غیر ملکیوں کے خلاف بھڑکاتا ہے اور برسر اقتدار طبقے کی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا ہے یہ دونوں بین الاقوامیت اور وسیع النظری کے خلاف ہیں۔

(۴) برسر اقتدار پارٹی کی سیاسی اغراض کے مطابق ماہرین خصوصی کی تیاری اور جارحانہ قوم پرستی کی خاطر اشتعال انگیزی۔

(۵) تمام پرانے ماہرین تعلیم اور اساتذہ کا صفایا اور ایسے اساتذہ کا تقرر جن کے ذریعہ تعلیمی ادارے کے طلباء کو نئے سیاسی رجحانات یعنی بالشویک نظریات کے مطابق تیار کریں۔ چنانچہ اس انوکھے طریقہ تعلیم کا نتیجہ ۱۹۳۰ء تک یہ برآمد ہوا کہ نئی نسل کی کثیر تعداد پرانے اصولوں سے بے بہرہ ہو گئی قدیم اخلاقی قدریں مٹ گئیں اور تعلیم دینے والوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا جو برسر اقتدار پارٹی کا "موس" اور "حقیقی بندہ" تھا۔

(۶) ادب اور فنون لطیفہ کی تعلیم کے علاوہ سائنس کی تعلیم تک قوم پرستانہ نقطۂ نظر سے دی جانے لگی اسی غرض کے لئے تاریخ کو نئے تو را نقطۂ نظر کے مطابق دوبارہ لکھا گیا۔ تاکہ بالشویزم کی داخلی پالیسی کو کامیاب بنایا جائے۔

(۷) سوویت نوجوانوں کو باہر کی دنیا سے یکسر بے خبر کر دیا گیا یا ان کو اس نقطۂ نظر سے تعلیم دی گئی جیسے روس کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ عالمگیر جنگ کے بارے میں یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ سوویت یونین نے فاشزم اور امپریلزم کے خلاف تن تنہا شرق و مغرب میں جنگ جیتی، حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ روسی اتحادی تھا [illegible]

ملک تھا۔

(۸) سوویت یونین روس میں صرف ۳۰ فیصد طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو چہارم جماعت سے اوپر کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، روس میں اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی شرح گری ہے۔ روس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب سے اس کی تعلیمی ترقی کو تنزل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۹) اکثر نوجوان اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں ہی صنعتی اور زراعتی تربیت گاہوں میں ٹھونس دئے جاتے ہیں خاص طور پر وسط ایشیا کی مسلم اکثریت کے علاقوں کے طلباء کے لئے اعلیٰ تعلیم تقریباً حرام ہو چکی ہے۔

(۱۰) روسی نظام تعلیم میں طلباء میں نظریاتی علم بالکل محدود رہتا ہے، اور ارتقاء و ترقی کے تمام جذبات ان کے سینوں میں دفن ہو جاتے ہیں اس اصول اور نظریہ تعلیم کی تہ میں دراصل سوویت حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کی مخصوص اغراض کار فرما ہیں، یہ لوگ بیرونی دنیا کو رجعت پسندی کا طعنہ دیتے ہیں اور اپنے ہر کام پر ترقی پسندی اور انقلابیت کا لیبل لگاتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ خود سب سے بڑے رجعت پسند اور فرسودہ خیال لوگ ہیں۔ یہ اپنی ذاتی اغراض اور خصوصی تحفظ میں اقتدار اعلیٰ کو محفوظ رکھنے کی خاطر ایسا انتظام کرتے ہیں کہ محکوم طبقات سے کوئی فرد اعلیٰ صلاحیت کا نہ نکل سکے۔

(۱۱) روس میں اب تو وہ دور پلٹ آیا ہے جو کبھی زار روس کے زمانہ میں تھا، وہاں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں زیادہ تر انہی لوگوں کو ملتی ہیں جو کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں یا پارٹی کے سفارشی ہوتے ہیں۔ کمیونسٹ لارڈ حکومت کی گدیوں پر بیٹھے عوام کے جسموں سے اسی طرح کھیل رہے ہیں جس طرح فرانسیسی نواب انقلاب فرانس سے قبل سینڈ کے طرح نے پر زمین میں خلل پڑ جانے کی وجہ سے اپنے ملازموں اور نوکروں کو زد و کوب کیا کرتے تھے کہ وہ ان مینڈکوں کو چپ کیوں نہیں کراتے۔

(۱۲) سوویت روس میں استادوں اور تعلیم دینے والوں کی سخت کمی ہے، اس کا ایک سبب تو قلیل تنخواہیں ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ اساتذہ کو طویل معاہدوں اور جبری قوانین کی پابندیوں میں جکڑ کر کسی ایسے مقام پر جس کے انتخاب میں ان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اس طرح باندھ دیا جاتا ہے جیسے جانور کے گلے میں رسی ڈال کر کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا دورۂ مہاراشٹر

حلقۂ پیام انسانیت کے تعاون کے سلسلے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۱۸ر جنوری ۱۹۷۶ء سے مہاراشٹر کا دورہ فرمائیں گے۔

۱۹، ۲۰، ۲۱ر جنوری	ناگپور و کامٹی
۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵ر جنوری	اورنگ آباد
۲۶ر جنوری	احمد نگر
۲۷، ۲۸ر جنوری	پونہ
۲۹، ۳۰، ۳۱ر جنوری	بمبئی

مولانا محترم کے ہمراہ مولانا معین اللہ صاحب [illegible] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (صدر کل ہند انجمن اصلاح المسلمین) اور اسحٰق جلیس ندوی (ایڈیٹر تعمیر حیات) ہوں گے۔

مرثیہ حضرۃ الاستاذ العلامۃ السید سلیمان الندوی رحمۃ اللہ علیہ

میں نے استاذ مرحوم کے جلسۂ تعزیت منعقدہ ۲۶-۲۷ر دسمبر ۱۹۵۳ء میں بمقام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ یہ مرثیہ پڑھا تھا اور دعا کی تھی کہ حضرت مولانا علی میاں کو اللہ ان کا بدل بنا دے۔ بفضلہ تعالیٰ دعا کی قبولیت کا اعلان عام ۸۵ سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء نے کر دیا۔ فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

(سید محمد عبد الغفار ندوی نگرامی)

کیسے بتاؤں غم کا عالم
کس کو سناؤں حالِ پُرغم
سوگ ہو کس کا؟ کس کا ماتم
ساری دُنیا چشمِ پُرنم
موت العالم موت العالَم

فخرِ مدارس جن کا ندوہ
دارِ مصنف جن پر شیدا
اُن کا ہوا جب یاں بے پردہ
سب پہ ہوا یہ صاف ہویدا
موت العالم موت العالَم

علم و ادب کی زیب و زینت
روحِ طریقت جانِ شریعت
جو تھے ہم میں ان کی رحلت
پھر نہ ہو کیوں دنیا کو کلفت
موت العالم موت العالَم

سیدِ ذی شاں فاضلِ دوراں
نورِ عرفاں یعنی سلیماں
سیرتِ پاک ہے جن کا احساں
ان کے غم میں خلق ہے بے جاں
موت العالم موت العالَم

ہر فردِ بشر پر انکی عنایت
دور سے ہیبت پاس سے الفت
ان کی عجب تھی شان وجاہت
ڈھونڈھے گی دنیا ان کی صورت

موت العالم موت العالَم

اُن کا سلیقہ سب کو بھایا
سب نے انھیں استاذ بنایا
آج نہیں ہے اُن کا سایا
غم کا بادل سب پر چھایا
موت العالم موت العالَم

علم و سیاست، زورِ خطابت
درس و بلاغ و حسنِ کتابت
سب میں نمایاں انکی فضیلت
ان کی جدائی سب کی مصیبت
موت العالم موت العالَم

مانگے دعا سب کی معذوری
ان کو ملی ہو حق کی حضوری
ان پہ ہو رحمت پوری پوری
دیکھی ضیاء سب کی مجبوری
موت العالم موت العالَم

اس ندوے پر رحم خدا کر
اس کو سلیماں اور عطا کر
بھائی علی کو ویسا بنا کر
ہم مُردوں کو پھر زندہ کر
موت العالم موت العالَم

مکتوب تسنیم فاروقی - بنام - مدیر "تعمیر حیات"

۲ر جنوری ۱۹۷۶ء

مکرم و محترم مدیر تعمیر حیات! سلام و تحیات

گزشتہ شمارہ (اشاعت خاص "تعمیر حیات") ملا تھا مگر بعض مصروفیات کے سبب فوری طور پر خراج تحسین کے شرف سے محروم رہا۔ آنجناب کی عظیم صحافت کی بلند اقدار کا حامل یہ نمبر اپنی مثال آپ ہے، بلکہ ہندوپاک کی صحافتی روایات میں شاید ابتک ایسا کوئی مذہبی ترجمان شائع نہ ہوا ہوگا۔ اسلام کی عالمی اور تعلیمی حکمت اور ندوۃ العلماء کی خدمت کا عکاس یہ پرچہ دینی صحافت کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے، بعض حقائق و شواہد کی بنا پر دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے تو اسے مجلد کروا کے محفوظ کر لیا ہے۔

میں نہایت ممنون ہوں آپ کے اس احسان کا۔ "تعمیر حیات" کی آئندہ اشاعت غالباً ۱۰ر جنوری تک ہوگی، بعض وجوہ سے مجھے اس شمارے کا انتظار ہے اگر ممکن ہو تو ایک پرچہ مجھے ضرور روانہ کروا دیجئے گا۔ اس کے اوراق میں پھر ایک بار شرکت کا خواہشمند ہوں۔ اک ذرا فرصت ہو تو تکمیل کر کے بھیجوں۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔ ادارے کے تمام حضرات کو میرا سلام ضرور فرمائیں۔ کسی کار لائقہ کے لئے یاد فرماتے رہیں گے تو سعادت سمجھوں گا۔ کبھی کبھی اسی طرح "تعمیر حیات" سے نوازتے رہیں گے تو احسان ہوگا۔

— تسنیم فاروقی

نیویارک سے مکہ تک

از: سید حبیب الحق ندوی

اس وقت ہم مادی دنیا کے مرکز "نیویارک" سے روحانی دنیا کے مرکز "مکہ" کا سفر کر رہے ہیں۔ آج مارچ کی بارہ تاریخ ہے۔ موسم نشاط انگیز ہے گرد، بادل اور بارش کی بجائے خوشگوار دھوپ زندگی کو متحرک اور فعال بنائے ہوئے ہے۔ ہم شہر کی پُرپیچ راہوں سے گذر کر نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر پہونچ چکے ہیں۔ یہ نیویارک کا سب سے بڑا بین الاقوامی ایئرپورٹ ہے۔ مسافروں کی چہل پہل اور ریل پیل جاری ہے۔ شام کے ۶ بج چکے ہیں۔ تیس آدمیوں پر مشتمل حجاج کا یہ قافلہ جس میں بیس طالب علم ہیں آپ کے سامنے ہے۔ یہ لوگ ولایاتِ متحدہ کے مختلف شہروں سے آکر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان میں کئی ڈاکٹر، طلبا بھی ہیں جو حرمین شریفین کی زیارت کا شوق سینوں میں چھپائے یہاں پہنچے ہیں۔ اس قافلہ میں کالے بھی ہیں اور گورے بھی۔ اور پیدائشی مسلمان بھی ہیں اور نومسلم بھی۔ فرداً فرداً سب کا تعارف مشکل ہے آئیے آپ کا تعارف وارث محمد سے کراؤں۔ یہ علی جاہ محمد زعیم بلیک مسلم تحریک کے دوسرے صاحبزادے ہیں، جو باپ کی جماعت سے بغاوت کر کے صحیح العقیدہ مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہیں اور امریکہ میں تبلیغ اسلام کے مستقبل کا چراغ ہیں۔ باپ نے عاق کر دیا ہے مگر دولت ایمان ان کے سکون کے لئے کافی ہے۔ دراز قد ہے، رنگ صاف ہے، ہندوستانی یا پاکستانی مسلمانوں میں اگر یہ کھڑے ہو جائیں تو امتیاز مشکل ہوگا۔

امریکی تاریخ میں غالباً پہلی بار حج کا موسم آیا ہے جس میں ۳۰ آدمیوں کا قافلہ لبیک لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک کہتا ہوا والہانہ وارفتگی کے ساتھ وادی بطحا کی طرف گامزن ہے۔ یہ صورت حال قرآن کریم "یاتین من کل فج عمیق" کی عملی تفسیر ہے۔ زائرین حرم آپ کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں۔ سامان افسران کے حوالہ کر کے اپنے ٹکٹ حاصل کر رہے ہیں۔

لیجئے ۷ بج گئے۔ طیارہ کی نبض تیز چلی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں آپ ایئرپورٹ کے پلیٹ فارم سے سن سکتے ہیں۔ افسران طیارہ تعجب اور احترام کی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ تعجب تو اس لئے کہ اس مادی دنیا میں تفریح، سیر، سیاحت، تفریح اور تفنن کے لئے اتنی بڑی رقم کا خرچ تو عقل میں آنے والی بات ہے لیکن ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی پر یہ صرف کثیر ذرا عقل سے بعید بات ہے۔ احترام شاید اس لئے کہ روحانیت میں اب بھی اتنی قوت موجود ہے کہ مادی مصروفیات اور دولت کے نشے میں مست انسان بھی کچھ دیر کے لئے جھک جاتا ہے اور اس طاقت کی فکر غیر شعوری طور پر کچھ دیر کے لئے ہی سہی، لاحق ہو جاتی ہے۔

اب ہم طیارہ کے اندر ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ ہماری اس جماعت کو ایک ساتھ وسط میں نشستیں ملی ہیں۔ آپ مسافروں کو تین حصوں کو تقسیم کر سکتے ہیں ایک حصہ آگے ہے، ایک حصہ پیچھے اور وسط میں حاملین قرآن کی یہ جماعت ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کا تعلق امت وسط سے ہے جو دو انتہاؤں میں اعتدال قائم کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ فرنگی مسافروں کی آنکھیں غیر معمولی طور پر پھٹی ہوئی ہیں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ایسی جماعت شاید پہلی بار دیکھی ہے جو ایک ناقابلِ شکست عزم کی مالک ہے اور یک گونہ وقار و اعتماد کے ساتھ لبیک لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک کی صدا بلند کر رہی ہے۔ تلبیہ کی گنگناہٹ سے ان کے کان کھڑے ہو گئے ہیں اور کوشش کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ کس منزل کے راہی ہیں۔

طیارہ اب مائل پرواز ہے۔ رن وے پر اس کی حرکت کے ساتھ ہی لبیک لبیک کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ ایک جست میں طیارہ خطوط طیران چھوڑ کر نیویارک شہر کے اوپر پہونچ چکا ہے۔ روزنِ طیارہ سے نیچے دیکھئے نیویارک شہر رنگین نقشوں کے خطوط میں بدل گیا ہے۔ اب یہ خطوط بھی بحراوقیانوس میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اب سطح زمین سے ۲۶ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں، نیچے بحراوقیانوس ہے، اوپر نیلگوں آسمان، بادل ادب سے سر جھکائے قافلۂ حجاز کے قدموں کے نیچے دیدہ و دل فرش راہ کرتے جا رہے ہیں۔ فرنگی اپنی تخلیق پر نازاں و فرحاں ہیں، قافلۂ حجاز فبای آلاء ربکما تکذبان کا ورد کر رہا ہے۔ طیارہ جانب لندن پرواز کر رہا ہے۔ نیویارک سے لندن کوئی ۷ گھنٹوں کی مسافت ہے۔ وقت کاٹنے کے لئے طیارہ کے اندر ٹیلی ویژن کے درجنوں سیٹ لگے ہوئے ہیں۔ کھانے کے بعد اعلان ہو چکا ہے کہ دو فلمیں دکھائی جائیں گی، تاکہ لندن میں اترتے وقت ایسا محسوس ہو کہ ابھی آپ سینما دیکھ کر گھر واپس لوٹے ہیں۔ ادھر فلم شروع ہوئی، ادھر برادرانِ اسلام نے ٹیپ ریکارڈ پر تلاوت قرآن پاک سننے کا پروگرام شروع کیا۔

رات کی نبض بحراوقیانوس کی گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی ہے۔ سپیدۂ صبح نمودار ہو رہا ہے۔ صبح کی اذان دی گئی، امیر کارواں نے امامت کی اور تمام حجاج اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ باندھے اشاروں سے نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ اس منظر نے ہمسفر فرنگیوں کے لئے معمہ کو حل کرنے کی بجائے مزید الجھا دیا۔

یہ لندن ہے، ابر آلود اور سرد ـــــ مگر نیویارک کے مقابلے میں کم مایہ اور غریب اب لندن سے ہم بیروت کی طرف رواں ہیں، طیارہ سے پانچ گھنٹوں کی مسافت ہے۔ یہ بیروت ہے، پہاڑوں پر آباد شہر ـــــ بیروت سے ہم جدہ جا رہے ہیں، طیارہ سے ڈھائی گھنٹہ کی راہ ہے۔ رات کے نو بج چکے ہیں۔ شہر جدہ حجاج کی آمد پر جگمگا اٹھا ہے اور صدائے ابراہیمی پر لبیک کہنے والوں کے لئے اپنا دامن وا کئے ہوئے ہے۔

یہ جدہ ایئرپورٹ ہے۔ ہر پانچ منٹ پر دنیا کے مختلف علاقوں سے طیارے عشاقِ حرم کو لیکر یہاں پہنچ رہے ہیں۔ کسٹم سے فراغت کے بعد ہم اپنی قیام گاہوں پر پہنچ گئے۔ آج ذی الحجہ کی ۴ تاریخ ہے، کل آپ ہمارے ساتھ مکہ چلیں گے ـــــ وہی مکہ جس کی تاریخ اپنے دامن میں کفار قریش کی داستانیں چھپائے ہوئے ہے تاریخ کے اوراق ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے الٹ رہے ہیں۔

آج ۵ ذی الحجہ ہے، ذرا نظر اٹھائیے اس امریکی قافلہ کو دیکھئے، آپ اب کسی کو نہیں پہچان سکتے رنگ برنگی لباس اتر چکا ہے۔ سب یک رنگ ہو چکے ہیں اب آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان میں غریب کون ہے اور امیر کون ہے؟ اس سفید کفن آسا لباس نے امارت و غربت، نسل و رنگ اور اونچ نیچ کے تمام امتیازات کو یک لخت مٹا دیا ہے۔ یہی نہیں یہ قافلہ اب قافلۂ امن ہے، امن و سلام اور صلح و خیر کی مجسم تصویر ہے اب مچھر، پتنگ اور چیونٹی تک کی جان لینا حرام ہے۔ سبھوں کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں گفتار و رفتار، نشست و برخاست میں سب پیکر امن و محبت ہیں، دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی ہیں ـــــ چہروں کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ آوازیں معمول سے بھاری ہوتی جا رہی ہیں ـــــ کیوں؟ اس لئے کہ یہ قافلہ اب سوئے حرم چل رہا ہے، اللہ کے گھر جا رہا ہے۔ کسی کے گھر انسان در و دیوار سے ملنے نہیں جاتا، بلکہ صاحب خانہ سے ملنے جاتا ہے۔ اسی احساس نے نفسیاتی کیفیات ہی کو بدل کر رکھ دیا ہے لبیک لبیک اللّٰھم لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک کا ورد عام ہے۔ نمناک آنکھیں سیل اشک کی تمہید ہیں، آپ ہمارے ساتھ حدودِ حرم میں داخل ہو رہے ہیں، یعنی جدہ سے مکہ کی طرف چل رہے ہیں اس وقت قافلہ والوں کی عجیب حالت ہے۔ نہ صرف اشکبار آنکھیں ماحول میں فرق پیدا کر رہی ہیں بلکہ بعضوں کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں، بعض نڈھال ہو رہے ہیں، بعض بآواز بلند رو رہے ہیں امریکی قافلہ میں سب کی زبانوں پر یہی ورد ہے کہ ہم گھر پہنچ کر خدا کے حضور میں اپنے آلام کا ذکر کریں گے۔

I am going to tell God, all of my troubles when I get home.!

آپ بیت اللہ کے قریب ہیں، اب حدودِ حرم میں داخل ہونے والے ہیں، باب السلام سامنے ہے، ادب و احترام کے ساتھ قدم بڑھائیے۔ ہر فرد کا قدم لڑکھڑا رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی مربع عمارت ہے۔ اوّل البیت وضع للناس لیکن اس کے رعب و جلال کا عالم دیکھئے۔ سلاطین و گدا اس کے سامنے سرِ نیاز خم کئے ہوئے ہیں۔ انسانوں کا ایک سیلاب ہے اس سیلاب میں ہم بھی ہمارے ساتھ طواف میں مصروف ہیں۔ غیر منظم مجمع اس طرح دھکے دے رہا ہے کہ کوئی تکدر و تنفر پیدا ہو سکتا ہے، لیکن تنفر کی بات نہیں۔ یہ مجمع اس وقت فرطِ شوق میں بے خود ہو رہا ہے، اپنے اور اپنے خالق کے درمیان کسی رکاوٹ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

دوسروں کے تاثرات کیا ہیں، میں نہیں کہہ سکتا۔ ہمارے تاثرات تو عجیب ہیں، ممکن ہے اوروں کو طواف کعبہ کے وقت الوہیت کا جلال نظر آ رہا ہو، ہمیں تو اس وقت عبدیت کا جلال نظر آ رہا ہے۔ اشکہائے بندگی کا ایک سیلاب ہے، جس میں لبوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے ہیں۔ دیکھئے، کپکپاتے ہوئے سائل ہونٹ عرشِ الٰہی کو پکار رہے ہیں۔ آسمان جھک جھک کر زمین کو چوم رہا ہے۔ کہیں شوخی و اقدام ہے کہیں خود سپردگی و خود فراموشی کہیں مجادلۂ محبت ہے کہیں اعتراف بندگی، کہیں یہ شوخ مطالبہ ہے ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

اور کبھی تنگیٔ ظرف کا اعتراف ہے ؎

میرا ظرف دیکھ کر بجلیاں گرا
مجھے تاب ہو جہاں تک وہیں تک نقاب اٹھا

خانۂ خدا کے ارد گرد قطار در قطار بندگانِ الٰہی: کالے، گورے، جوان اور بوڑھے، عورت اور مرد مختلف زبانوں میں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے مصروفِ دعا ہیں ان کی ... زبان پر ایک ہی التجا ہے "الٰہی ہمیں دین و دنیا کی بھلائی سے بہرور کر۔" یہ منظر دیکھتے دیکھتے ہم خیالات کی دنیا میں کھو گئے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ حدود حرم میں آج تک کسی کو کھوتے نہیں دیکھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم کھو گئے۔ اس وقت ہم علم الٰہیات (Metaphysics) کی بھول بھلیوں میں گم ہیں، جہاں تلاش خدا کی پرپیچ راہوں میں متکلمین و فلاسفہ صدیوں بھٹکتے رہے، سر پٹختے رہے اور ہاتھ پیر مارتے رہے لیکن انہیں کوئی کنارہ نہ مل سکا۔ اس وقت ہم سقراط سے قبل دور کے فلاسفہ کے ساتھ ہیں، یہ فیثاغورس (Pytha-goras) ہیں، یہ ہیراکلیٹس (Heraclitus) ہیں، سامنے پرمانیڈس (Parmenides) ہیں، ساتھ ہی ایمپیڈوکلیس (Empedocles) اور پروٹاگوراس (Protagoras) کھڑے ہیں۔ ان سب کو خدا کی تلاش ہے۔ یہ سب اپنی اپنی دانست کے مطابق خدا کی ذات و صفات کو متعین کر رہے ہیں، چلئے آگے بڑھیں۔ سامنے سقراط ہیں، افلاطون ہیں، ارسطو ہیں، یہ سب خدا کی جستجو میں سرگرداں ہیں لیکن ان کے فکر کی بنیادیں بھی ظن و تخمین ... (Speculative philosophy) پر قائم ہیں اس لئے بیچارے کوشش کے باوجود اسرار کائنات کی نقاب کشائی نہ کر سکے۔ آگے بڑھئے ... Hellenic ... [illegible] فلسفہ کا عالم جمالیات اور اس کی رعنائیاں دیکھئے، اپی کورین (Epicureans) کی دنیا سے ہوتے ہوئے ہم Stoicism کی دنیا میں پہنچ گئے جہاں خدا کی اہمیت پر زیادہ زور ہے۔ پلوٹائنس (Plotinas) سے ہو کر ہم عیسائیت کے فلسفہ تثلیث تک پہنچ گئے، سینٹ آگسٹائن (Saint Augustine) تک پہنچ کر ہم نے چھ صدیوں کا سفر طے کر لیا۔ اب ہم Papacy کے تاریک دور (Dark ages) سے گذر رہے ہیں، اس اندھیرے میں گیارہ صدیاں گذر گئیں، ۱۲ ویں صدی سے چھلانگ لگا کر ہم تیرہویں صدی میں آ گئے ـــــ Saint thomas aquinas وغیرہ سے ملتے ہوئے آگے بڑھے، نشاۃ ثانیہ (Renaissence) کی رنگینیاں دیکھئے۔ سامنے ہیوم (Hume) کھڑے ہیں، اب تحریک اصلاحات (Reformations) کی صدائیں گونجنے لگیں، سائنس کا دور شروع ہو گیا بیکن (Bacon) اور ہوبس (Hobbes) اپنا منشور لئے کھڑے ہیں، جدید فلسفہ کا جد امجد ڈیکارٹ (Descartes) خود اپنی ذات کے لئے ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے ـــــ اسپنوزا (Spinoza) کے بعد لیبنز (Leibniz) سے ملاقات ہو گئی، آگے بڑھے تو لبرلزم (Libralism) کا دور شروع ہو گیا۔ لوک (Locke) اپنا نظریہ علم و سیاست پیش کرنے لگے۔ اور آگے بڑھے تو برکلے ... (Berkeley) اور ہیوم (Hume) نے خوش آمدید کہا۔ کچھ آگے رومانی تحریک کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس کے بعد روسو (Rousseau) کا سامنا ہو گیا۔ پھر کانٹ (Kant) نے اپنا فلسفہ پیش کر دیا۔ اس طرح ۱۸ ویں صدی تک کا سفر طے ہو گیا۔ ۱۹ ویں صدی میں ہیگل کا سامنا ہوا۔ بائرن (Byron) اور شوپنہار سے مل کر آگے بڑھے تو نٹشے (Nietzsche) اپنا نسخہ انسان کامل (Superman) لیکر سامنے آ گئے۔ اس طویل فکری جنازیم سے نکلے ہی تھے کہ انتشار و تشکیک کا سامنا کرنا پڑا۔ کارل مارکس اپنا فلسفہ پیش کرنے لگے۔ راستہ میں برگساں (Bergson) مل گئے۔ بیسویں صدی میں وجودی فلسفہ نے ہمارا راستہ گھیر لیا۔ اکتا کر ہم امریکہ پہنچ گئے جہاں خدائے حرم God is dead کا فلسفہ مقبول ہوتا جا رہا ہے اور خدا سے دامن چھڑا کر انسان چین کا سانس لینا چاہتا ہے۔ تین ہزار سالوں کا سفر صحرائے فکر کی دشت نوردی پھر بھی جس کی تلاش تھی وہ نہ ملا ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اس کے بعد چونکے اور آنکھ کھلی تو دیکھا خانۂ کعبہ سامنے ہے۔ "یہیں بھی دیکھو مولا، یہیں نہ بھولیو مالک - یہیں حسنۃ فی الدنیا اور حسنۃ فی الآخرۃ دونوں سے نوازیو" کا ورد حسب معمول وہی لینے دینے کی باتیں ہو رہی تھیں، وہی شوخی و اقدام ہے، وہی خود فراموشی و خود سپردگی وہی ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کی التجا جاری ہے۔

وہ دیکھئے خدا مردہ نہیں، وہ تو زندہ ہے ورنہ لین دین کی باتیں کس سے ہو رہی ہیں؟ ہم نے ایک آواز لگائی، اے ماضی و حال کے فلسفۂ فرنگ! کاش تمہاری ارواح تشنہ کو یہ منظر دیکھنا نصیب ہوتا، اور اسی خانۂ خدا میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی۔ پھر تمہارے علم الٰہیات کی بنیادیں مختلف ہوتیں ظن و تخمین کی بجائے ایمان و ایقان کی دولت تمہیں نصیب ہوتی۔ خدا فلسفہ کی خشک کتابوں میں نہیں ملتا، اس کے وجود و صفات کی تعیین منطقی تحلیلات کے ذریعہ نہیں ہوتی، وہ تو خانۂ کعبہ میں ملتا ہے زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو کر بھی اپنے گھر میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ جوں جوں ڈھونڈنے والوں کو نہیں ملتا۔ وہ تو سادہ لوح قلوب میں جو یومنون بالغیب کے قائل ہیں، جاگزیں ہوتا ہے، اے فلاسفۂ غرب و شرق! خدا ما بعد الطبیعیاتی علوم (Metaphysics) یا فلسفہ جزو کل ... (ontology) کی حدود سے باہر ہے۔ تمہارا محدود علم غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا، وہ تمہیں ایمان بالغیب کے بغیر نہیں مل سکتا۔

اس گم گشتگی اور بازیابی کے بعد ہم پھر حسب معمول طواف کر رہے ہیں۔ طواف سے فراغت و مروہ کے بعد رات کے گیارہ بج گئے۔ رات گذر گئی اور آج ذی الحجہ کی ۸ تاریخ ہے۔ جمعہ کا دن ہے نماز کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جماعت سے گھنٹوں قبل عاشقانِ حرم صفوں میں پہنچ گئے تاکہ جماعت مل سکے، تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ حد نظر تک آدمی ہی آدمی ہیں نماز ختم ہو چکی پھر طواف کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ ۲۴ گھنٹے اسی طرح جاری ہے جس طرح گھڑی کے ڈائل پر سکنڈ کی سوئی متحرک رہتی ہے۔

نماز جمعہ کے بعد ہم تاریخی مقامات کی زیارت کے لئے جا رہے ہیں۔ دیکھئے حرم سے دس منٹ کی راہ ہوگی، یہ چھوٹی سی پیلی عمارت ہے جسے وزارت اوقاف نے لائبریری میں تبدیل کر دیا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ اس وقت اس کمرہ میں ہیں جو خوشبو سے معطر ہے۔ زائرین کا تانتا بندھا ہے دبیز قالین کمرے میں بچھا ہوا ہے۔ کچھ لوگ خاموش ادب کے ساتھ قالین پر بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ دعائیں مانگ رہے ہیں، کچھ درود و سلام پڑھ رہے ہیں... جی یہ وہی کمرہ ہے جس میں پیغمبر اسلام کی پیدائش ہوئی تھی۔ ... آپ ایک مسلمان کے قلب و جگر کی کیفیات کا اندازہ لگائیں۔ ....

اب ہم دوسرے تاریخی مقام کیطرف جا رہے ہیں۔ ٹیکسی والے سیدھے مناسبات نہیں کرتے ہم نے ایک گدھا گاڑی کرلی امریکی قافلہ آپکے سامنے گدھا گاڑی پر سوار ہے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی گدھا گاڑی پر بیٹھا ہو ... کہاں ہوائی جہاز اور کاروں کا سفر کہاں دھوپ میں بے چھت کی گاڑی کی سواری۔ غرض اب آپ ان راہوں سے گذر رہے ہیں جہاں تیرہ سو سال قبل کفار قریش اور اکابرین مکہ کی رہائش گاہ تھی۔ عصر کا وقت ہو چکا ہے ہم پہاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں اور پُرپیچ عمودی و غیر عمودی چڑھائی کے لئے کمربستہ ہیں۔ ہمارے ساتھی اکھڑ رہے ہیں لیکن نومسلم امریکی جوانوں کی ہمت قابل دید ہے۔ ان کا ولولہ اور جوش ایمانی خاندانی مسلمانوں سے بے حد مختلف ہے، یہ تاریخی حقیقت بھی ہے، ابتدا میں بھی نومسلموں کے ہاتھوں یہ دعوت آگے بڑھی تھی جب تک عربوں میں یہ حوصلہ رہا اللہ نے انہیں آگے بڑھایا ان کا حوصلہ ختم ہوا تو دوسری قوموں کو کھڑا کر دیا۔ پہلے ایرانیوں، سلاجقہ، عثمانی ترکوں اور افغانوں کو اللہ نے کھڑا کیا۔ جب انکے ایمان پر غنودگی طاری ہو گئی تو اللہ کے لئے مشکل نہیں کہ وہ ایک نئی قوم کو کھڑا کرے، قرینہ غالب ہے کہ نومسلم امریکی آبادی کے ہاتھ آج نہیں تو کل یہ دعوت پھیلے گی۔ اس وقت جو لوگ اس دعوت سے متاثر ہو چکے ہیں وہ راسخ العقیدہ اور تحریک کے شیدائی بھی۔

آپ ہمارے ساتھ اس پہاڑ کی چوٹی پر دو رکعت نفل نماز پڑھ لیں۔ پھر ہم اس غار میں داخل ہو گئے جس کا نام غار حرا ہے۔ یہ وہی غار ہے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کفر زار مکہ کے خطرناک ماحول سے پناہ لیا کرتے تھے۔ توحید کے مطلع پر سوچتے تھے۔ آخر اللہ نے اقرأ باسم ربک الذی خلق سے تحریک توحید کی ابتدا کر دی۔ یہیں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر مکہ کی وادی میں اترتے تھے ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

آج ذی الحجہ کی سات تاریخ ہے ہزاروں فٹ کی بلندی پر ٹیکسی چڑھ رہی ہے نشاط انگیز ہوا چل رہی ہے خنکی بڑھتی جا رہی ہے، سرسبز پہاڑی نظر آیا۔ پہاڑی پر کھیتی کے مناظر دلکش ہیں اب ہم چوٹی پر پہنچ گئے ہیں یہ وہی بازار ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے گئے تھے۔ رسول اللہ کا جسم لہولہان تھا، پھر بھی آپ دست بدعا تھے "بار الٰہا انہیں ہدایت دے یہ نہیں سمجھتے۔" یہ طائف ہے ... طائف کا معروف بازار ... نہ جانے کیوں یہاں کے لوگوں کی صورتیں دیکھ کر ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے تھے ہم یہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ پورے سفر میں کوئی مقام ایسا نہیں آیا جہاں اس قدر تکدر ہوا ہو۔

مکہ واپس آ کر طبیعت بحال ہوئی۔ حرم کی چہل پہل اور رونق نے افسردہ دلی دور کر دی۔ رات کشمکش میں گذر گئی۔ آج ۸ ذی الحجہ کی صبح ہے منیٰ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یہاں پہاڑیوں کی قدرتی چہار دیواریاں بنی ہوئی ہیں لاکھوں خیمے پڑے ہیں، اسی احاطہ میں جرمنی، انگلینڈ، سوڈان، مصر و شام اور دیگر بلاد اسلامیہ کے برادرانِ اسلام کا پڑاؤ ہے۔ ایک بڑا خیمہ جلسے کے لئے مخصوص ہے، باجماعت نماز روزانہ کے بعد تقاریر ہو رہی ہیں۔ مختلف ممالک میں دعوت اسلام کے کام کی روداد سنانے کا سلسلہ جاری ہے۔ دعوت حق کی راہ میں مشکلات اور مصیبتوں کا ذکر ہے۔ ان کامیابیوں کا بھی تذکرہ ہو رہا ہے جو اللہ نے مخلصین کو مختلف علاقوں میں عطا کی ہیں۔

یہ پوری بستی کفن آسا سفید لباس میں ملبوس ہے۔ امریکی قافلہ بالخصوص تو یک رنگی اور اخوت و مساوات کا یہ منظر دیکھ کر بے حد متاثر ہے بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی روایات پر خندہ زن بھی ہیں، انہیں یقین آگیا ہے کہ یہ یک رنگی و مساوات محض توحید کی برکت ہے۔ وحدت فکر اور وحدت نظر کا کرشمہ ہے۔ وہ اس فکر میں غلطاں ہیں کہ ایسی وحدت ان کے اجداد کو کیوں نصیب نہیں ...

پھر کھو گیا۔ اپنے اجداد کے فکری سرمایہ کی تحلیل شروع کر دی اور اپنے اجداد کے مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنے لگا۔

۱۔ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کا عرفان کیسے ممکن ہے؟

۲۔ کیا دنیا Mind اور Matter دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہے، اگر ایسا ہے تو دونوں کی تعریف کس طرح ممکن ہے۔ آیا وہ ایک دوسرے کے تابع ہیں یا دونوں کا وجود الگ الگ ہے؟

۳۔ نظام عالم میں کوئی وحدت ہے یا نہیں؟ تخلیق عالم کا کوئی مقصد بھی ہے؟

۴۔ کائنات کسی خاص منزل کی طرف بڑھ رہی ہے یا جامد ہے؟

ان سوالات پر سوچنے میں ۶ صدی قبل مسیح سر کھپایا جا رہا ہے۔ پھر بھی کوئی حل نہ مل سکا اس کا حل جدید سائنس کے پاس بھی نہیں۔ آج سائنس اور مذہب کے درمیان ایک سرحدی نشان ضرور کھینچ دیا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان میں جو (No man's Land) ہے وہ ان سوالات کے حل کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔ جہاں فلسفی آج بھی سر پیٹ رہے ہیں اور علماء ما بعد الطبیعات کے ہاتھ تیر مار رہے ہیں۔

ارسطو کے دور تک فلسفہ پر توہمات (Speculation) کا سایہ رہا۔ انسانوں کی اطاعت کا صحیح مستحق کون ہے اس دور کا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ طے پایا کہ ریاست (State) انسانوں کی اطاعت کی حق دار ہے۔ چنانچہ شہر (City) اور ریاست (State) کی پوجا شروع ہو گئی۔ اس تحریک کے خلاف بغاوت شروع ہوئی۔ Stoic فلاسفہ نے اعلان کیا کہ روح کا رشتہ خدا (خالق روح) سے ہونا چاہیے نہ کہ ریاست سے۔ "... A man's duty to God is more important than his duty to the state..."

پانچویں صدی عیسوی سے ۱۶ صدی عیسوی تک مغرب میں تاریکی کا دور رہا۔ اسٹیٹ اور چرچ کی جنگ چلتی رہی۔ پوپ نے اٹلی، فرانس، اسپین، برطانیہ، آئرلینڈ، جرمنی، اسکنڈے نیویا اور پولینڈ میں اپنی حکومت و سربراہی کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے بعد پوپ کی طاقت کچھ کم ہونے لگی۔ جب برطانیہ کے بادشاہ نے اسکی طاقت کو کمزور کر دیا، تاہم چرچ شکست نہ کھا سکا۔ شاہ اپنی فوجی قوت کے باوجود بے دست و پا تھا۔ فوج اگر شاہ کے ہاتھ میں تھی تو نظام تعلیم چرچ کے ہاتھوں میں تھا جس کی وجہ سے عوامی فکر کی [illegible]

وفاداری اس نظام تعلیم کی بنا پر قائم رہی، جو زیر قبضہ چرچ کے ہاتھوں میں تھا کہ موت کے بعد بادشاہ جنت کا مستحق ہوگا یا جہنم کا۔

عہد وسطیٰ (Middle ages) میں فریڈرک ثانی نے چرچ اور پوپ کے خلاف نئے مذہب اور کلچر کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن تھومس اکوئنس (Thomas aquinas) چرچ کا علمبردار رہا۔ دونوں انتہا پسندی کی دو حدوں پر تھے۔ توازن اور اعتدال قائم کرنے کی آرزو لے کر کوئی پچاس سال بعد دانتے (Dante) کا ظہور ہوا لیکن ادھر دانتے کی آنکھ بند ہوئی ادھر توازن کی کشتی غرق آب ہو گئی۔ تحریک اصلاحات نے عیسائی دنیا کی کمر توڑ دی۔ پوپ کے حسین خوابوں کی عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب علوم قدیم و جدیدہ کے احیاء اور تجدید کا زور ہوا تو اسرار کائنات کی سراغرسانی کا جذبہ بڑھا کوپرنکس (Copernicus) نے اپنا علم نجوم پیش کیا۔ مسائل کی تفسیر میں اب منطقی استدلال، تحلیل اور تنظیم پر زور دیا گیا۔

پندرہویں صدی میں پوپ اور بادشاہ دونوں اپنا اثر کھو بیٹھے پوپ حکمرانوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے۔ اٹلی سیاسی بحران کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانے میں میکیاولی ...... (Machiavelli) کا ظہور ہوا جس نے اپنی معروف کتاب "پرنس" میں حصول اقتدار کا نیا نسخہ پیش کیا۔ اس نے حکمرانوں کو تمام روایتی و اخلاقی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا۔ اخلاقیات اب توہمات قرار پائے حصول اقتدار اور اس کا کسی طرح برقرار رکھنا سب سے بڑی اخلاقی قدر قرار پایا۔ اس فلسفہ نے روحانی و اخلاقی اقدار کا تصور ہی مٹا دیا۔ روما الکبریٰ کا زوال ہو گیا اور روم اب دوسری اقوام کا محکوم بن گیا۔ نہ شہنشاہ رہے نہ چرچ ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

۱۶ ویں صدی سے مغربی افکار میں تجدید و اصلاح کی تحریک چلی جو درحقیقت روم کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ عوام و حکمران دونوں مذہب سے باغی تھے۔ اور ہر تجدید اور تبدیلی کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ پورا شمالی یورپ مارٹن لیوتھر کا گرویدہ ہو گیا۔ ساتھ ہی عیسائی مذہب کے دو ٹکڑے ہو گئے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ اول الذکر کے عقیدہ کے مطابق وحی کا دروازہ بائبل کے بعد بند نہیں ہوا ہے بلکہ ہر زمانہ میں چرچ کے ذریعہ آسمانی وحی آتی رہے گی۔ لہٰذا چرچ انسانوں کی اطاعت کا حقدار ہے۔ اس کے برخلاف پروٹسٹنٹ نے نیا عقیدہ اختیار کیا جس کے مطابق آسمانی وحی سے چرچ کا کوئی تعلق نہیں۔ وحی بائبل میں موجود ہے

ہر شخص چرچ کی مدد کے بغیر حقائق کی جستجو اور سراغرسانی کر سکتا ہے۔

جدید فلسفہ کا بانی ڈسکارٹس ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا، اس کی اپنی شخصیت تمام توجہات کا مرکز بن گئی۔ اپنی شخصیت اور وجود کے یقین کے بعد ہی وہ دیگر ذوات کے وجود پر یقین کا قائل تھا۔ اس طرح اس نے برکلے، کانٹ اور Fichte کی راہ ہموار کر دی جن کے خیال میں ہر شے کے ظہور کا مصدر اصلی (Ego) ہے۔

۱۸ ویں صدی میں شخصیت پرستی (Hero-worship) کا زور بڑھا۔ کارلائل اور نیٹشے نے اپنے اپنے نظریات شخصیت پرستی اور انسان کامل کا نسخہ پیش کیا۔ بائرن نے اپنا نظریہ (Cult of violent passion)...... پیش کیا۔ اس ذات پرستی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹ ویں صدی میں رومانی تحریک یا انسانیت کا زور ہوا۔ اس سیلاب میں ادب، آرٹ، کلچر، سیاست سب بہہ گئے، اب انسان آرٹسٹ کے تخیل کا حسین خواب بن گیا۔ انفرادیت کے اس تقشف کے خلاف پھر تحریک چلی اور لبرلزم کا زور ہوا۔ لاک (Locke) اس کے قائدین گئے۔ وہ انفرادیت پرستی، شخصیت پرستی، روایات پرستی سب کے خلاف تھے۔ حکومت کی مطلق العنانی کے بھی خلاف تھے۔ اس تحریک نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کرنا چاہا اور ردّ عمل کے طور پر ریاست پرستی کی تحریک پھر زندہ ہو گئی۔ ہیگل، روسو اور ہابس (Hobbes) اسی نظریہ ریاست پرستی کے مختلف پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ ان کے خیال میں اطاعت و فرمانبرداری کی حقیقی مستحق اسٹیٹ ہے۔ اشتراکیت براہ راست اس فلسفہ کا بچہ نہیں، لیکن اس کے قریب ضرور ہے کیونکہ کمیونٹی (Community) اور ریاست نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔

غرض ۲۴ سو سال کا سفر طے ہو گیا، لیکن انسانیت ایک دم آگے نہ بڑھ سکی — قدیم یونانیوں کے ہاں شہر (City) اور ریاست (State) واجب الاطاعت تھے۔ آج بیسویں صدی میں ہزاروں نشیب و فراز سے گذر کر دنیا وہیں پہنچ گئی ہے۔ وہی ریاست پرستی و قوم پرستی جزو ایمان بن گئی ہے۔

فکر کی وادی میں کچھ دیر بھٹکنے کے بعد ہم واپس منیٰ پہونچ گئے۔ اس تاثر کے ساتھ کہ جو معاشرہ وحی کی ہدایت سے محروم ہوگا وہ اسی طرح پراگندگی اور وحدت فکر و عمل سے محروم ہوگا۔ وحدت صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے جو اختلافات میں بھی یکجہتی و یگانگت پیدا کر سکتی ہے۔ اسلامی تاریخ حوادث اور تغیرات سے بھری ہوئی ہے۔ امت مسلمہ کے زوال و [illegible]

کی داستان کم الناک حسرت انگیز نہیں لیکن تمام بدنصیبیوں کے باوجود لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قوت تسخیر کسی دور میں کم نہیں ہوئی اسی کلمہ کا اعجاز ہے کہ منیٰ میں ہر سال اپنی نوعیت کا واحد اجتماع عظیم ہوتا ہے۔ فکر و فلسفہ کی اس خشکی کے بعد منہ کا مزا بدلنے کے لئے مختلف علاقوں کے لوگوں سے ملیں۔ ان کے خیموں میں گشت لگائیں۔ نو مسلم امریکی بھائی ویسے بھی ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں۔ مختلف خیموں میں انہیں تقریر کی دعوتیں دی جا رہی ہیں تاکہ یہ اپنے تأثرات کا اظہار کریں۔ حتیٰ کہ اخبارات اور ریڈیو کے لئے بھی ان سے بیانات لئے جا رہے ہیں۔

آج ذی الحجہ کی ۹ تاریخ ہے ہم سب عازم عرفات ہیں، کاریں اور بسیں قطار میں لگی چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔ دھوپ تیز ہے اور فضا غبار آلود پھر بھی لوگ بسوں کی چھتوں پر بیٹھے ہیں، مارچ کے مہینے میں دھوپ کی یہ شدت غیر متوقع ہے لیکن شرق کی بدنظمی قطعاً غیر متوقع نہیں، ٹریفک کی بدنظمی کی وجہ سے گھنٹوں سڑک پر کھڑے ہیں۔

اب ہم سب میدان عرفات میں ہیں — روایت ہے کہ عرفات میں سارا وقت کھڑے ہو کر دعاؤں میں گزارنا مسنون ہے، اور ہر دعا مقبول ہوتی ہے۔ لوگ خیموں کے اندر اور باہر کھڑے دعاؤں میں مصروف ہیں لیکن جبل الرحمۃ کا منظر عجیب پرکیف، روح پرور اور نشاط انگیز ہے پوری وادی اس وقت انسانوں کا سمندر معلوم ہوتی ہے اور جبل الرحمۃ پر انسانوں کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں، آگے قدم بڑھانا مشکل ہے بلکہ سہولت سے سانس لینا دشوار ہے۔ جبل الرحمۃ کے اوپر ایک سفید تیر نصب ہے۔ جو دور سے نظر آتا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر حجۃ الوداع کے موقعہ پر آخری خطبہ دیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے خطبہ دے رہے ہیں۔ یہ کیفیت احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ہمارے کان اس آخری خطبہ کے مضامین سن رہے ہیں جو انسانی تاریخ کا ایک عظیم خطبہ ہے۔

عصر کی نماز اور تلاوت قرآن کے بعد لوگ کھڑے ہو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگ دست بدعا ہیں اپنی کوتاہیوں اور تقصیرات کے اعتراف کے ساتھ توبہ کر رہے ہیں...... ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کی التجا جاری ہے۔

مغرب کی نماز ہو رہی ہے نماز کے بعد

ہم سب مزدلفہ کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ تاکہ ایک شب وہاں بسر کریں اور پھر منیٰ واپس ہوں...... یہ مزدلفہ ہے، اوپر آسمان نیچے ریگستان، نہ خیمہ ہے نہ کوئی اوٹ...... اوپر اللہ ہے...... نیچے بندگان خدا...... ساری رات لوگوں نے عبادت میں گذاری۔ اب صبح کی نماز پڑھ کر پھر منیٰ کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔

—— یہ منیٰ ہے وہی ہما ہمی اور جوش و خروش ہے۔

آج ۱۰ ذی الحجہ ہے۔ لوگ قربانیوں کے لئے قربان گاہ جا رہے ہیں قربانیوں کے بعد شیاطین کا رجم جاری ہے، دو مزید دن منیٰ میں گذار کر قافلہ مکہ میں واپس آ گیا۔

خانہ کعبہ کا طواف ہو رہا ہے۔ خدا سے نئے عہد و پیمان باندھے جا رہے ہیں حجر اسود کا استلام ہو رہا ہے، مقام ابراہیم پر نمازیں پڑھی جا رہی ہیں، آب زمزم سے تشنگی دور کی جا رہی ہے اور صفا و مروہ کی آخری سعی ہو رہی ہے۔

ہم مناسک حج سے فارغ ہو گئے زندگی کے ایک اہم اسلامی فریضہ سے جو ہر عاقل و بالغ صاحب استطاعت مسلمان پر فرض ہے، فارغ ہو کر اب مدینہ کی طرف جا رہے ہیں، روضۂ رسول نظروں میں سمایا ہوا ہے...... مکہ سے جدہ جاتے ہوئے ہم سب مدینہ چل رہے ہیں، لیجئے آپ مدینہ سے قریب ہیں۔ یہ مقام بدر ہے جہاں حق و باطل سے پہلی بار نبرد آزما ہوا تھا۔ اس میں حق غالب اور باطل مغلوب ہوا۔

یہ مدینۃ النبی ہے...... یہاں مکہ سا شکوہ نہیں، آفاقیت کا جلال نہیں، بندگی کی تواضع نہیں۔ لینے دینے کی باتیں نہیں...... لین دین کی باتیں تو حدود حرم میں ہو چکیں...... اب تو صرف دینے اور اپنے آپ کو فدا کرنے کا سوال ہے۔ عاشقان رسول اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں۔ یہ وہی انصار کا شہر ہے جہاں انہوں نے اپنا سب کچھ رسول کے لئے لٹا دیا تھا۔

آپ اس وقت مسجد نبوی کے پاس ہیں سامنے باب السلام ہے، لوگ مسجد نبوی میں داخل ہو رہے ہیں عاشقان رسول کی زبانوں پر اس وقت ایک ہی صدا ہے۔

(۱) السلام علیک یا احمدؐ

(۲) السلام علیک یا محمدؐ

(۳) السلام علیک یا رسول اللہ

(۴) السلام علیک یا نبی اللہ

(۵) السلام علیک یا حبیب اللہ

مختلف لہجوں میں یہی ایک صدا گونج رہی ہے۔ اس کیف و مستی کی فضا میں ہم سب کھو گئے ایک بار پھر ہمارا ذہن ان مستشرقین اور سوانح نگاران مغرب کی طرف متوجہ ہوا، جنہوں نے پیغمبر اسلام

کی زندگی کو داغدار ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ العیاذ باللہ مجنون و شاعر بتایا، مرگی کا مریض ثابت کیا، خود غرض سیاستداں اور نفس پرست انسان ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کیں، انہیں جادوگر بتایا، غرض ؂

کیا کیا تمہیں نہ تراشا گئے عدو

اے مردہ اور زندہ دانشوران فرنگ! اگر محمدؐ جادوگر ہوتے تو یہ جادو کتنے دن سر چڑھا رہتا؟ سو سال؟ دو سو سال؟ دنیا کی تاریخ میں کسی سیاسی، اخلاقی اور مذہبی جادو کا زور کچھ عرصہ زیادہ رہا ہے؟ اگر کبھی تمہیں اس سرزمین سے گزرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہوتی، اگر تم نے کبھی درود و سلام کی یہ صدا سنی ہوتی تو شاید تمہاری اخلاق حس تمہیں متنفر کرتی اور تم اس بہتان تراشی سے باز رہتے اور توفیق ہوتی تو اب یہاں آ کر دیکھو کہ آج ۱۴ سو سالوں کے بعد بھی اقطار عالم سے عاشقان رسول آ کر درود و سلام بھیج رہے ہیں اور نبی آخر الزماں کی مدح و ثنا میں رطب اللسان ہیں ؂

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست
زانکہ ملت را حیات از عشق اوست
برگ و ساز کائنات از عشق اوست

اے رسالت محمدیؐ کا انکار کرنے والو تمہیں کیا معلوم کہ ؂

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را
لانبی بعدی ز احسان خداست
پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است

اے عقل کے پجاریو، اور اے ترقی کے دعویدارو صرف اتنا بتا دو...... ہے کوئی دوسرا پیغمبر جسے یہ سلام سرمدی اور حیات ابدی نصیب ہوئی؟ اس قصے کو چھوڑیئے اور آئیے مسجد نبوی کے اندر داخل ہوں، درود و سلام پڑھئے آپ روضۂ رسولؐ کے سامنے ہیں، یہ سامنے روضۂ اطہر ہے، ہماری زبانوں پر ایک ہی نغمہ ہے ؂

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ

آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

جناب رسالت مآب میں یہ درخواست دیکر ہم سب باہر نکل رہے ہیں اور چند تاریخی مقامات کی زیارت کے لئے چل رہے ہیں۔ آپ اب جبل احد کے دامن میں ہیں۔ سامنے حضرت حمزہ کا مزار ہے۔ یہاں سے آپ خندق پہنچ گئے۔ مساجد خمسہ، مسجد قبلتین، مسجد قبا وغیرہ کی زیارت کے بعد اب آپ مدینہ یونیورسٹی میں ہیں، جہاں سے فلاسفۂ مغرب کو ہم آخری صدا دے رہے ہیں ؂

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم

ہمارا سفر اب مکمل ہو چکا...... امریکی قافلہ آخری درود و سلام کے بعد شہر مدینہ سے جدہ واپس ہو رہا ہے۔ یہ بیروت ہے —— بیروت سے آپ ہمارے ساتھ پھر لندن واپس آئے اور لندن سے نیویارک واپس چل رہے ہیں، یہ نیویارک ہے۔ اب آپ روحانی دنیا کے مرکز مکہ سے مادی دنیا کے مرکز نیویارک میں واپس آ گئے جہاں مرحوم جمعیت اقوام کی وارث اقوام متحدہ نے جنم لیا ہے اور جس کی نسل جنیوا سے ہجرت کر کے نیویارک پہنچ گئی، اس کے لئے مکہ سے ہم وہی پرانا پیغام لائے ہیں ؂

مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

۔۔۔۔۔۔

دینی تعلیمی کونسل اترپردیش نمائندہ رابطہ عالم اسلامی کی نظر میں

رابطہ عالم اسلامی کے ہفت روزہ ترجمان "اخبار العالم الاسلامی" کے چیف ایڈیٹر محمد محمود حافظ ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے اپنے اخبار کو جو رپورٹ بھیجی وہ تین قسطوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے دینی تعلیمی کونسل کے عشائیہ کا تذکرہ کیا ہے اور سپاسنامہ میں پیش کردہ اغراض و مقاصد کا بھی ذکر کیا ہے اور کونسل کے تحت تعلیم کاموں کے لئے ہر مسلمان بلکہ خاص طور سے عرب ممالک سے تعاون کی اپیل بھی کی ہے۔

وہ دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کے عشائیہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"دینی تعلیمی کونسل اترپردیش نے ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی میں شریک ہونے والے وفود کے اعزاز میں عشائیہ کا انتظام کیا اور سپاسنامہ پیش کیا۔ کونسل کے ذمہ داروں نے اپنے سپاسنامہ میں اس کے اغراض و مقاصد کو روشناس کرایا (انہوں نے مزید لکھا ہے کہ) اس کونسل کے صدر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب ہیں۔"

وہ لکھتے ہیں: "کونسل کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ تاکہ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت، دیکھ بھال اور مذہب اسلام اور قرآن کی باتوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور اس کار خیر کے ذریعہ اپنے علمی وجود کو ختم اور متاثر کرنے والے دھاروں کا مقابلہ کیا جائے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں: "کونسل کے زیر نگرانی ۲ لاکھ سے زائد مسلمان بچوں کو تعلیم دی جا رہی ہے اور کونسل کے قائم کردہ دس ہزار سے زائد ابتدائی مکاتب ریاست اترپردیش کے ۵۴ ضلعوں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے اور اس کی آبادی بھی ۹۰ ملین ہے۔"

کونسل کی مساعی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"یہ عظیم جدوجہد اور کاوش جس کو دینی تعلیمی کونسل کے لوگ انجام دے رہے ہیں وہ دنیا کے ہر مسلمان اور خاص طور سے ہم عربوں سے امداد و اعانت، ہمدردی اور حمایت کے مستحق ہیں تاکہ اپنے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہونچا سکیں، اور ذمہ داران کونسل اس پوزیشن میں آ جائیں کہ اپنی جدوجہد کو مزید وسیع اور منظم کر کے مسلمان بچوں کی دینی تعلیم پر کامیابی کے ساتھ توجہ کر سکیں۔"

کونسل کے منصوبوں کے متعلق وہ رقم طراز ہیں:

"مجھے ان کے منصوبوں اور آئندہ کے پروگرام کے متعلق علم ہوا جو اصحاب خیر صرف کار خیر سمجھ کر انجام دے رہے ہیں...... اللہ ان کی کاوشوں اور جدوجہد میں برکت دے۔

دینی تعلیمی کونسل کا اپنا ایک وسیع نظام العمل ہے جس کے بیشتر گوشے مادی وسائل کی کمی کی وجہ سے منجمد ہیں۔"

محمد محمود حافظ دینی تعلیمی کونسل کے عظیم کام پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ جس چیز نے ہم کو متأثر کیا وہ کونسل کے کام کی عظمت ہے۔ اس کے اخراجات مسلمانوں کے چندہ سے پورے کئے جاتے ہیں جو اصحاب خیر حضرات عطا کرتے ہیں، نیز غلہ کی شکل میں یعنی کھیتوں کی پیداوار، چاول اور گیہوں وغیرہ کی شکل میں دیتے ہیں جن کو فروخت کر کے کونسل کے عظیم کام مکاتب کی ترویج و ترقی میں لگا دیا جاتا ہے۔"

(تلخیص و ترجمہ: از مولانا محمد واضح رشید ندوی [illegible])

جرس فریاد می دارد

(اجلاس ندوۃ العلماء میں ۲ نومبر ۱۹۷۵ء کو پڑھی گئی)

رشید کوثر فاروقی

دفتر "الشبان المسلمون"
۱۱۲۱ - بھوانی پیٹھ، پونا ۲
۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء

اخی فی الاسلام!

آپ کی شکایت بجا ہے کہ میں نے منتظمین اجلاس کو نظم کی نقل نہیں دی اور آپ اسے "تعمیر حیات" کی اشاعت خاص میں شامل نہ کر سکے۔ یہ یوں کہ نقل تھی ہی کہاں جو پیش کرتا۔ کاغذ کے جن پرزوں پر اس کا مسودہ ہوا تھا انہیں کو دور سے پڑھ دی گئی تھی۔ اس نظم کی کہانی دلچسپ ہے، آپ کو بھی سناؤں؟ ندوۃ العلماء کے ہر حال تقسیم کا دعوت نامہ تو ایک ماہ پہلے ہی مل چکا تھا اور میں نے شرکت کا فیصلہ بھی کر لیا تھا مگر اجلاس کے انعقاد سے ایک ہفتہ پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ کا گرامی نامہ ملا جس میں انہوں نے بڑی ترغیب و تاکید سے تحریر فرمایا تھا کہ ندوۃ العلماء کے گذشتہ اور غیر معمولی اجلاسوں میں مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے بلند پایہ ادیب و شاعر موقع کی مناسبت سے اپنا کلام سناتے تھے۔ اگرچہ کام کی کثرت کے سبب یہ خط تاخیر سے لکھا جا رہا ہے لیکن امید ہے کہ آپ توجہ کریں گے اور کوئی علمی و اصلاحی نظم پڑھیں گے تاکہ صحت مند ادب کی نمائندگی بھی ہو اور ہماری روایت بھی تازہ رہے کہ اس اجلاس میں عالم اسلام کی ممتاز علمی و دینی شخصیتیں حصہ لے رہی ہیں۔

ایک طرف مخدوم گرامی کا ذاتی حکم نامہ اور یہ احساس کہ انہوں نے انتہائی مصروفیتوں کے باوجود یاد فرمایا۔ "سن کر باشم کہ در آن خاطر عاطر گزرم" —

دوسری طرف میری مصروفیتوں کی بے پناہ عنایت گیر بات: بیساقہ امتحانات کی بے سکونی، تدریسی ذمہ داریوں کا نقطۂ عروج، پھر ریاستی حکومت کے نئے تعلیمی ضابطوں پر بحث و احتجاج کے سلسلے میں نشستوں پر نشستیں۔ بار بار کوشش کی کہ بہ تکلف ہی سہی، طبیعت کو موزوں پر مائل کروں لیکن سلیقے کا ایک شعر بھی موزوں ہوا ہوتا کہ صورت حال کی بے کیفی سے مطلع کر دیا تھا اور لئے قدرے اطمینان تھا کہ اگر نظم نہ کہہ سکا تو وہ معذور رکھا جاؤں گے۔ آخر پونے سے روانگی کا دن آ گیا اور میں "الشبان المسلمون" کے رفیقوں کے ساتھ لکھنؤ کے لئے چل پڑا۔ سفر شروع ہوا تو مولانا محترم کے تصور اور اجلاس کے خیال کی طرف یکسوئی ہوئی۔ آنکھ کی آنچ میں تخیل کی گنگا نے لگی، جذبات دل سے اٹھ اٹھ کر آنکھوں سے برسنے لگے، احساسات نے معانی کا اور معانی نے الفاظ کا روپ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ مسافروں کا شور تو کچھ ایسا مخل نہ تھا لیکن اپنے ساتھیوں کی رو بر رو موجودگی کڑا امتحان تھی۔ بار بار محتاط ہونا اور آپے میں آنا پڑتا تھا لیکن ربودگی اور از خود رفتگی، شعور کے ہر حجاب پر غالب آ کر رہی اور سب نے دیکھ لیا کہ شاعرانہ دیوانگی، سرگشتگی کا دورہ کیسا ہوتا ہے۔ سوز و آہنگ کا ایک آبشار تھا کہ اُمڈا آتا تھا۔ عام حالات میں نظم کہتے وقت ترتیب و تسلسل کا شعوری اہتمام کرنا پڑتا ہے لیکن اس نظم میں اشعار ہی نہیں ترتیب و تسلسل بھی اس طرح "نازل" ہوئے کہ نظر ثانی کرتے وقت تقدیم و تاخیر کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ میں تو اسے مولانا کا تصرف سمجھتا ہوں۔ بارے سفر ختم ہوا اور اجلاس شروع۔ وہاں کی ہماہمی میں تبیض ہوتی تو کیسے اور کب؟ اور مولانا رابع صاحب ندوی کو دیجاتی تو کیونکر؟ یوں ہی پڑھ دی گئی اور بعد کو تازہ ترین مصروفیات نے یہ خیال ہی نہ آنے دیا کہ تعمیر حیات کے لئے بھیجنا ہے۔ اب آپ طلب فرماتے ہیں تو حاضر ہے۔

آپ نے اجلاس ندوہ سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کرنے کی مجھ سے فرمائش کی ہے۔ یہ آپ کی محبت اور کوثر نوازی ہے ورنہ جس تقریب نے الامام الاکبر شیخ الازہر جیسی شخصیت کو سراپا تاثر بنا دیا ہو اس پر مجھ سا بے بضاعت کیا قلم اٹھائے گا۔ پھر اس جلوہ زار صد رنگ کی قلمی تصویر کھینچنا چاہوں بھی تو وقت کہاں سے لاؤں؟

ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آپ نے میری حالت دیکھی ہے، انگریزی زبان و ادب کی تدریس کا پیشہ الگ، کالجوں کے نوجوانوں میں اسلام کا تعارف "الشبان المسلمون" کی تنظیم و تربیت اس سلسلے میں کئی کئی طلباء سے درس اور تقاریر وغیرہ کے لئے باہر کے سفر الگ۔ میری مصروفیات یا کم سے کم معاشی ذوق میں ہم آہنگی بھی نہیں جس کے سبب اعصاب پر بڑا بوجھ پڑتا ہے۔ اب دیکھئے، قیام رائے بریلی کے سلسلے میں ایک مضمون "ایک عشرہ سئی کے کنارے" مدتوں سے ذہن کو گدگدا رہا ہے، ابھی تک لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے آپ کو وہ بھیج لوں، پھر کچھ اور سوچوں۔

تاہم بات نکل ہی آئی ہے تو اجمالاً کچھ عرض کر دوں۔ اس جشن تعلیمی کا ایک روشن اور خوش آئند پہلو ہر کس و ناکس میں عربی کی اہمیت کا شعور ہے۔ اجلاس کے اکثر شرکا لکھنؤ سے یہ تہیہ کر کے چلے ہیں کہ عربی زبان کی تحصیل و ترویج میں منہمک ہو جائیں گے۔ عربی ہے کہ قرآن، رسول اللہ، امہات المومنین اور صحابہ کی زبان ہے۔ عقیدت تو ہر مسلمان کے دل میں پہلے سے موجود تھی، چنانچہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں کا ضبط و نظم اور سکون سماعت اس عقیدت کا مظہر تھا، لیکن عربی کی ضرورت بلکہ ناگزیریت کا احساس جاگ اٹھا اور لوگوں نے بچشم سر دیکھ لیا کہ دینی اجتماعیت کی خاطر دل کا ساتھ جب تک زبان نہ دے گی، امیر ملت کا تصور، تعمیر منارۂ بابل کی طرح خواب ہی رہے گا۔

ایک ذیلی فائدہ اردو کو بھی پہنچا اور جنوبی ہند وغیرہ سے آئے ہوئے مسلمانوں پر جو غریب اردو سمجھنے و ترجمے سے بھی قاصر رہے، رابطے کی زبان کی حیثیت سے اردو کی اہمیت اور واضح ہو گئی۔

یہ حقیقت بھی خوب سب کو معلوم تھی کہ ہم ایک عالمی اور بین الاقوامی امت ہیں، صدر نشین پر برادران و بزرگان ممالک عربیہ کو اٹھتے بیٹھتے اور انہاک دلی یکسوئی و محبت سے خطاب کرتے دیکھ کر زندہ مشاہدہ اور تجربہ بن گئی۔ اس سے حوصلے بلند ہوئے ہیں، کملائی ہوئی بستیں شاداب ہوئی ہیں اور فکر و نظر کا افق کشادہ ہوا ہے۔

اجلاس کے حیرت انگیز نظم نے خود اعتمادی اور اخوان ندوہ کی شائستہ و منکسر مزاجی نے اخوت عالم کے جوہر نکھارے ہیں۔

اور سب سے بڑا کارنامہ اس اجلاس کا میرے نزدیک یہ ہے کہ اس نے علما کا وقار بحال کیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ مسلمانوں میں یہ بصیرت بیدار کر دی ہے کہ قیادت و سربراہی کا منصب انبیاء کا ہے جو نبوت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ دور ہی رہیں، ان کا کام تھوڑی ہے۔ انہی راہ گزینوں کی نگاہ ہمہ گیر و آسمان رس ہے اور ان کا مقام ہر ایک مقام سے آگے ہے۔ اسی تاثر کی جھلک میں نے تقریباً ہر چہرے پر دیکھی خصوصاً سیکڑوں غیر مسلم۔

نوجوانوں کو اپنی جہالت و گوتاہیوں اور بے سوادی پر ندامت پایا اور انہیں اہم گفتگو کرتے بھی سنا کہ علم دین نہیں تو علم دنیا اب بے معنی ہے۔

چلتے چلتے ایک اعتراف کو جی چاہتا ہے۔ دینی اداروں کے ذوق جمال سے مجھے شکایت سی رہی تھی سوائے اجلاس کی نظافت و نفاست دیکھ کر جاتی رہی۔ ندوۃ العلماء سے وطن میں ہے آنے کچپن میں بھی دیکھا ہے، مختلف تقریبوں میں بھی دیکھا ہے، لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران بھی دیکھا ہے لیکن اب کی بار جو جمالیاتی حیثیت سے پہنچا اور اس کی قدیم عمارت کو جو پیشین منظر کی حیثیت رکھتی ہے، ہلکے ہلکے رنگوں میں غسل کئے ہوئے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ کسی کاریگر نے اصلی عمارت کو اتنا دیدہ زیب بلکہ نظر فریب بنا دیا تھا کہ ؎

غمازہ انگشت بدندان کہ اسے کیا کہئے

گویا فرق تعمیر کی دل آویز باب آئینہ دیکھ رہی ہوں، گویا کسی معصوم شباب کی کوئی ملکوتی تمنا مجسم ہو گئی ہو۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا یہ بام و در خشتوں لے بنائے ہیں اور کیا جیسے وہ بنا رہے تھے تو جنت کی حوریں اپنے اوراق ترنم میں قرآن کی ترتیل کر رہی تھیں؟ سادہ، پاکیزہ، مسرت انگیز، سحر کن، دریچوں اور دروازوں کے خطوط سے کھیلتی ہوئی گنگا جمنی دھوپ چھاؤں، جمال حیات اُمڈا پڑ رہا تھا اور وہاں بار اس رنگ کی شفق دامن سو فوانیس جگا جگا ہو کر سبز گون روشنی، ورنگ نور کے اس انتخاب و امتزاج پر مبارکباد قبول کیجئے۔ میرا معمول ہو گیا تھا کہ چار روزہ نشستوں کے لئے کالونی جاتے ہوئے آتے وقت ٹھہر ٹھہر کر اور جاتے وقت مڑ مڑ کر دیکھتا تھا اور شکن احتشام علی کاکوروی مرحوم (جو اس دور میں ندوۃ العلماء کے معتمد مال اور ناظم تعمیر تھے) اور ان کے رفقاء کے لئے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔

یہ تھا ندوۃ العلماء کی عمارت کا صوری پہلو۔ اندر جائیے تو اس کی معنوی جاذبیت دیکھ کر عقیدہ بے انداز ہو جاتی تھی۔ یہ تھی دارالعلوم کی علمی و ثقافتی نمائش اور اسلامیان ہند کی ہشت صد سالہ تاریخ لوح و قلم۔ غور و تامل کرنے والے کے لئے تو اس میں برسوں کا مواد تھا لیکن کمال زینت و ترتیب کی داد دیجئے کہ چند لمحات کی طائرانہ نگاہ بھی دائمی تاثر کے نقوش محفوظ کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ شیخ ازہر نے یہ جو فرمایا کہ دنیا میں علوم اسلامیہ پر اتنا مسلسل اور منظم کام ہندوستان کے سوا کہیں نہیں ہوا، کچھ یوں ہی نہیں کہہ دیا۔ ایک عالم اور علمی شخصیت کا یہ خراج تحسین بڑا قیمتی ہے اور یہ تھا بات نہ آتا اگر آپ اور آپ کے رفیقوں نے ایک لاکھ مطبوعات، تین ہزار مخطوطات اور اہل قلم کے اسماء و خدمات کی تختیاں، وصلیاں اور جدولیں ایسی ہنر مندی و خوش سلیقگی سے سجائی نہ ہوتیں۔

جشن و نمائش دونوں نے ندوے کی بے تعصبی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ندوی نہیں ہوں بلکہ ایک لحاظ سے اصلاحی ہوں کیونکہ میرے بچے مدرسۃ الاصلاح میں انگریزی پڑھاتے ہیں اور عربی پڑھتے ہیں اس لئے میری نگاہ غیر جانبدارانہ بھی نہیں، ناقدانہ بھی تھی۔ تاہم مجھے کہیں اور کسی وقت بھی تعصب کی بو نہیں آئی۔ یوں تو یہ ندوۃ العلماء کا ۸۰ سالہ جشن تھا اور ظاہر ہے کہ ندوہ بھی عالم اسلام کا ایک بازو تھا اس لئے اس کا ممتاز و نمایاں ہونا فطری ہے، تاہم میں نے دیکھا کہ نمائش کے انتہائی تنہائے تعارف میں سے صرف تین نمبر ہی کی خدمات سے ہیں اور باقی تمام ملت مسلمہ ہندیہ کے کارناموں سے متعلق تھے۔ یہی نہیں کہ تمام مسلم اداروں سے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی، شاہ بر بلائے گئے تھے بلکہ میں نے "الرائد" وغیرہ میں ہندوستان کی تمام مسلم درسگاہوں کا نام بنام ذکر بھی دیکھا۔ اس طرح ان کا تعارف اہل ملک اور اہل ملک ہی سے نہیں، دنیائے اسلام سے بھی ہو گیا۔ توقع ہے کہ ندوہ، رواداری، بلند نگاہی اور اسلامی مواخات کی اس روایت زریں کو قائم رکھے گا بلکہ آگے بڑھائے گا کہ ملت کے ہزاروں امراض کا واحد علاج یہی بے نفسی ہے۔

بے نفسی کا لفظ آیا تو مجھے اپنا ایک اور مشاہدہ یاد آیا جس کا تذکرہ کئے بغیر نہ رہوں گا۔ آپ کو میں نے ایک بار بھی "مدیر تعمیر حیات" کی حیثیت سے زن شہیر (limelight) پر نہیں دیکھا۔ اس درجہ مصروفیت کے باوجود آپ کی کارگزاریاں خاموش رہیں۔ ایک میدان جیت لیا اور خود گوشہ گیر رہے یعنی اتنی یادگار نمائش کر دی اور اپنے آپ کو مستور رکھا لیکن اللہ سے کچھ مستور نہیں بلکہ جو جتنا ہی نا پرساں ہے اس پر اسی نسبت سے لطف و التفات بھی ہے۔

مجھے اپنی ایک رُباعی یاد آ گئی ؎

تعمیر کی دھن میں جو لگا رہتا ہے
وہ منظر عام سے جُدا رہتا ہے
بھرتا ہے دھنک میں رنگ کیسے کیسے
سورج گھر اوٹ میں چھپا رہتا ہے

بارِ خاطر نہ ہو تو اس سے معنی میں مشابہ اور تشبیہ میں مختلف ایک رباعی جو اسی خاکسار کی ہے اور ملاحظہ ہو ؎

ہر چشمۂ جوہر نظر آتا ہے کہے
منظر پس منظر نظر آتا ہے کہے
گم نام رہا کرتے ہیں ارباب کمال
بنیاد کا پتھر نظر آتا ہے کہے

اور ان موثرات میں، جن کا ذکر دو ایک میں کر رہا ہوں، کون سی بات ہے جو اپنی جگہ بہت بڑا حاصل نہیں۔ زمین اجلاس کے باران رحمت نے نرم کر دی ہے، اب قلبہ رانی و تخم ریزی اور آبیاری کی ضرورت ہے۔ میدان بھی بن گیا ہے اور وہ خطوط بھی کھینچ گئے ہیں جن پر فرزندان ندوہ اپنی صحافت و سیاحت کے ذریعے اور مسلمانوں کی علمی و عملی زندگی سے سلسل اور مستقل ربط قائم رکھ کر منزلوں پر منزلیں تعمیر کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر خدا نخواستہ پہلا قدم ہی کافی سمجھ لیا گیا تو یہ ایک المیہ ہوگا۔ کانفرنسیں کتنی ہی بڑی کیوں ہوں اور کتنی ہی اہم ان کے اثرات دیرپا و دوررس نہیں ہوتے جب تک اسٹیج کے عزائم اور فیصلوں پر ثبات کے ساتھ قرار کے ساتھ گھر گھر اور گلی گلی خاموش و بے غل عمل نہ ہو۔ پھر تو ان کی نوعیت صرف برقی صدمات (electric shocks) کی رہ جاتی ہے۔

تعمیر حیات کی اشاعت خاص نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ اس اجلاس پر آپ کا رپورتاژ چھپے گا۔ مشتاق و منتظر ہوں۔ حق یہ ہے کہ آپ بہت کام کر رہے ہیں اور خوب کر رہے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بیشتر اور خوب تر کی توفیق دے۔ آمین!

عاقبت منزل یا وادی خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ
رشید کوثر فاروقی

بجناب مولانا اسحٰق جلیس صاحب ندوی
مدیر "تعمیر حیات" کے نام

شام کو جب ڈوبتا ہے آفتابِ لالہ گوں
تیز ہو جاتی ہے جانے کس لئے نبضِ جنوں
جیسے آ جاتی ہے آنکھوں تک اُمڈ کر جوئے خوں
کروٹیں لیتا ہے دل میں پیچ و تابِ اندروں
گھیر کر ماضی کی یادیں لوٹ لیتی ہیں سکوں
جان سی چپ میں چلی جاتی ہے کچھ منہ سے کہوں

یا سحر کو منتشر ہوتی ہے بزمِ انجمیں
کیوں یہ دونوں وقت ہوتے ہیں قیامت آفریں
سنسناتی ہیں نسیں نس نس بھیگ جاتی ہے جبیں
آنسوؤں سے جھلملا اٹھتی ہے اکثر آستیں
یک بیک طوفان بن جاتی ہے موجِ تہ نشیں
بن زباں کھولے کوئی تسکین کی صورت نہیں

کھل گیا ہے ذہن میں اک رنگِ عہدِ باستاں
امتِ مرحومہ سُن لے مجھ سے اپنی داستاں

تیرے آبا تھے اِسی دنیا کے باشندے مگر
نفس ان سے منفعل، شیطان ان سے منہزم
اہلِ دنیا پر نوامیسِ الٰہی کے گواہ
کلیدِ زندگی قرآن پر جامعِ عمل
ان کا ایما پا کے اپنا رخ بدل دیتی ہوا
جنبشِ خامہ لکھے دیباچۂ طوفانِ نیل
پاؤں سے اقصائے عالم کی طنابیں کھینچ دیں
کارزار اُن کے لئے مثلِ شبستانِ عروس
پھینک دیتے کاٹ کر قالینِ دربارِ شہی
انکی بیداری بھی وہ جیسے کسی کا خواب ہو

طارمِ اعلیٰ پہ لے پہنچا انہیں عرفانِ ذات
انکی دہلیزوں پہ آ کر گر پڑے لات و منات
سر بسر میزانِ بے پاسنگ تھی ان کی حیات
نے فقط امر و سیات نے فقط صوم و صلات
ان کی مرضی دیکھ کر چلتا نظامِ ممکنات
وہ دعا کر دیں تو پھوٹے ریت سے موجِ فرات
ناپ کر بالشت سے رکھ دیں بساطِ کائنات
کوچ اُن کی فوج کا جیسے روانہ ہو برات
طمطراقِ روم پر ضائع نہ کرتے التفات
اور قوموں کے جو افسانے وہ ان کے واقعات

مدتوں کرتے رہے جو کچھ خدا کہتا رہا
پھر تو انکے منہ سے جو نکلا خدا نے کر دیا

انکے ہونٹوں کا تبسم مژدۂ امن و سلام
رقص انکا رقصِ بسمل، رنگ انکا رنگِ خون
جوش آ جائے زمیں میں انکو پیاسا دیکھ کر
دور کی جنگاہ بھی ان کے لئے شطرنج ہو
مار و کژدم انکی اک للکار پر جادہ گریز
کاسہ گر جائے تو واپس لائیں امواجِ رواں
ٹھوکروں سے توڑتے تھے منہ لگا لینا تو خیر
ٹانک لیتے تھے جو کانٹوں ہی سے بوسیدہ قبا
جس سے انسانی تصور کو پسینہ آ گیا
وہ جدھر نکلے اُدھر موسیقیاں برسا گئی

انکے ماتھے پر ابھرتی سلوٹیں تمہیدِ جنگ
اور مزامیر انکے شمشیر و سناں، تیغ و تفنگ
انکے تازی ضربِ سم سے کھول دیں آغوشِ سنگ
میرِ لشکر تک پہنچ جائے صدا جیسے خدنگ
انکے آگے سرنگوں جنگل میں ضرغام و پلنگ
تیر جائیں انکے گھوڑے سیل میں جیسے نہنگ
لوٹتا تھا انکے قدموں میں جہان رنگ رنگ
ان کا نام آتے ہی شاہانِ جہاں آشفتہ رنگ
ایسی جودت، ایسی رو، ایسی اُپج، ایسی ترنگ
کاروانوں کی حدی خوانی، کمانوں کی ترنگ

شرم کا موقع ہے ظالم، ناز کا موقع کہاں
ان کی ایسی رفعتیں اور تیری ایسی پستیاں

جس کے آبا وعدۂ جنت سے بھی کانپے وہ قوم
ساری دنیا میں ہے تنہا امتِ قرآنیاں
باہمی جنگوں کی صفین و جمل تو یاد ہیں
تاج دیتا ہے سوادِ اعظمِ امت انہیں
ظالموں کی کاسہ لیسی کر رہے ہیں کج کلاہ
ہے اداکاروں کی راہوں میں ہجومِ زائراں
کیسی رنگیں ہیں خدایا بے خلش بے احتساب
گر پڑا خود آسمانوں کی بلندی سے ہلال
بارگاہِ روس و امریکہ سے وحیوں کا نزول
ہائے فرزندانِ مغرب اور آغوشِ حرم
جاہلیت تازہ ہے، اسلام کہنہ ہو گیا
مریمیں، خنسائیں، زہرائیں، زُبیدائیں ہیں یہ
انتخابِ حسن بھی، جسموں کی پیمائش بھی ہے
حیدر و طارق انہیں گودوں میں پالے جائینگے

بے عمل بخشش کی قائل مست بے خوفِ عذاب
عمر بھر سنتی ہے پڑھتی ہو جو بے سمجھے کتاب
بدر و خندق سے بھی کیا ممکن ہے کوئی انتساب
جنکو صبح و شام شوقِ شاہد و شغلِ شراب
رام کر رکھے ہیں صیادوں نے شہباز و عقاب
پردۂ سیمیں ہے گویا اسوۂ عہدِ شباب
کیسے دل ہیں جن پہ خلوت میں نہیں اتری کتاب
سرکشانہ قہقہہ زن ہے صلیبِ کامیاب
اور آمنّا و صدّقنا مسلماں کا جواب
پرورش پاتے ہیں زاغک کے نشیمن میں غراب
بے حجابی محترم ٹھہری ہے رسوا ہے حجاب
بے لحاظ و خودنما، زینت فروش و بے نقاب
فخر کا اعلان بھی ہے، زندہ باد اے انقلاب
پتھروں سے چاند نکلیں گے، ببولوں سے گلاب

قوم کی تقدیر تحریرِ سرِ دیوار ہے
قوم گویا خودکشی کے واسطے تیار ہے

بندگی کی، مقصدِ تخلیقِ انساں کی قسم
ذاریات و یوسف و زلزال و فرقاں کی قسم
ہود و رعد و طارق و تطفیف و لقماں کی قسم
لولو و فیروزہ و یاقوت و مرجاں کی قسم
ماہِ تاباں کی قسم، مہرِ فروزاں کی قسم
نغمۂ داؤد و اقلیمِ سلیماں کی قسم
بدر و مکہ کی قسم، میثاقِ رضواں کی قسم
نفسِ مومن کی قسم، قلبِ مسلماں کی قسم
اوّل اوّل ابتلائے اہلِ ایماں کی قسم

پاکیِ انجیل کی، تقدیسِ قرآں کی قسم
مرسلات و مریم و انفال و رحماں کی قسم
نور و نوح و یونس و یٰسین و انساں کی قسم
زعفران و زرنب و نسرین و ریحاں کی قسم
آسماں کی نیلی وادی میں چراغاں کی قسم
طورِ سینا کی، نصیبِ آلِ عمراں کی قسم
فتحِ افریقہ کی، فتحِ روم و ایراں کی قسم
عزم کی، اصلاح کی، تقویٰ کی، احساں کی قسم
آخر آخر انہدامِ بابِ زنداں کی قسم

آج بھی اللہ کی سنت کے پیمانے وہی
منزلِ لیلیٰ وہی، نکلیں تو دیوانے وہی

روز و شب کی، اختلافِ نور و ظلمت کی قسم
آسمانوں کی، زمیں کی اور جنت کی قسم
قرنِ اوّل کی قسم، دورِ خلافت کی قسم
جذبۂ دل کی، سخاوت کی، امانت کی قسم
استقامت کی، عزیمت کی، حمیت کی قسم

نفسِ لوّامہ کی، ایامِ قیامت کی قسم
ارضِ ربانی پہ انسانی نیابت کی قسم
عزلِ خالدؓ کی، کمالِ سمع و طاعت کی قسم
نعرۂ حق کی، صداقت کی، شجاعت کی قسم
آزمائش کی، اسارت کی، شہادت کی قسم

اہتمامِ توبہ و سیلِ ندامت کی قسم
جاوداں، معصوم اسلامی شریعت کی قسم

عاقبت کی، مغفرت کی، روح و رحمت کی قسم
دین کے اتمام کی، ختمِ رسالت کی قسم

جسکو تو اسلام سمجھی ہے کہاں اسلام ہے
بے خبر! اسلام تو علم و عمل کا نام ہے

علم کو فہرستِ معلوماتِ انسانی نہ جان
علم کو یاروں نے کر رکھا ہے محدودِ معاش
علم وہ ہے جس کو فطرت بے تامل مان لے
علم وہ ہے جس سے چونک اٹھے ضمیرِ زندگی

علم امریکہ کی، یورپ کی کتابوں میں نہیں
علم قابوں میں، پیالوں میں، کبابوں میں نہیں
علم بحثوں میں، سوالوں میں، جوابوں میں نہیں
علم خوابوں میں، خیالوں میں، سرابوں میں نہیں

علم شاخِ گل کی نکہت ہے، عمل نوشینہ ہے
یا یہ کہیے علم چہرہ ہے، عمل آئینہ ہے

آدمی کا ذہنِ ناقص علم کا منبع نہیں
علم سقراط و فلاطون و ارسطو کو نہیں
علم کو ایتھنز میں، پیرس میں، لندن میں نہ ڈھونڈھ
علم کا مغرب ہے، کہتے ہیں جسے تعلیمِ نو

علم کا منبع تو پہنائے دلِ انساں میں ہے
علم دامانِ خبیبؓ و مصعبؓ و سلمانؓ میں ہے
علم کا جلوہ حرا میں، ثور میں، فاراں میں ہے
علم کا مشرق سوادِ مصحفِ قرآں میں ہے

یہ جمالِ ہستی و حسنِ ازل کا علم ہے
علمِ ربانی حقیقت میں عمل کا علم ہے

قاریِ قرآں ہے گویا خدا سے ہم کلام
پیکرِ کردار میں یہ علم ڈھل جائے تو ہے
ہر قدم حدِ نظر پر، ہر نظر افلاک پر
یہ چلے پیدل تو قسطنطین قلعہ کھول دے
اس کے پیوندوں میں مل جاتا ہے کسریٰ کا غرور

طالبِ قرآں کی آغوش میں پیغمبری
سربلندی، فرخی، بینش، آگہی، بختاوری
خواب میں آتا نہیں اس کو خیالِ کمتری
یہ فرس پر ہو تو جھک جائے شانِ سروری
اس کی گلیوں میں پڑا پھرتا ہے تاجِ قیصری

جن کو یہ علم و عمل آیا انہیں کے دن پھرے
چاندنی بن بن کے پھیلے، برق بن بن کر گرے

چشمِ شاعر دیکھتی ہے ملتِ بیضا کا حال
کون مانے گا کہ تھا علم و عمل تیرا شعار
آج اپنے گھر میں قرآں حرفِ نامعلوم ہے
اے کہ تو پیغمبرِ آخرؐ کی ہے پیغام بر
تو نمک ہے اس زمیں کا، تو پہاڑی کا چراغ
تجھ کو سرخیلِ امم بننا ہے ہنگامِ حساب
آبجو بن کر اڑی جاتی ہے طوفاں کیوں نہ بن
اے نشانِ عظمتِ پیشینیاں! بیدار ہو
پیشِ آہنگِ جہاں! بیدار ہو، بیدار کر

آہ یہ غفلت، یہ مایوسی، زوال اندر زوال
چند نخلستان ورنہ چار جانب ریگ زار
زندگی احساسِ محرومی سے بھی محروم ہے
نبضِ دوراں ڈوب جائے گی نہ ابھری تو اگر
تو ہی دھرتی کے دلوں کا دل، دماغوں کا دماغ
خیرِ امت ہے تجھے دینا ہے دنیا کا جواب
حاشیہ بن کر مٹی جاتی ہے، عنواں کیوں نہ بن
اے ضیائے نیّرِ مشرق ستاں! بیدار ہو
امتِ اسلامیاں! بیدار ہو، بیدار کر

ہاں تری آواز، آوازِ پرِ جبریلؑ ہے
سانس جو باقی ہے وہ بھی صورِ اسرافیلؑ ہے

(رشید کوثر فاروقی)

حسین و مفید دستاویز

محمد گڑھ ہاؤس
امیر گنج بھوپال
مورخہ ۲۵؍ دسمبر ۸۰ء

مکرمی و محترمی زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ؛

ندوۃ العلماء کے تاریخ ساز جشنِ تعلیمی کی کارروائی کی حسین و مفید دستاویز کی شکل میں تعمیرِ حیات کا مخصوص شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس اشاعت کی لاجواب ترتیب میں آپ کی قابلیت اور عرق ریزی محنت واضح اور نمایاں ہیں، جو قابلِ ستائش اور لائقِ قدر ہیں۔ اس شمارہ میں مخدومی و مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ العالی کی تقاریر، اسلامی ملکوں کے نظامِ تعلیم پر حضرت مدظلہ کا اہم ترین مقالہ، اہم ذکر کا خطبۂ صدارت نیز مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ڈاکٹر نجات اللہ صاحب صدیقی، جناب … احمد صاحب اور ڈاکٹر … الحق صاحب کے فکر انگیز مقالات اور مولانا محمد الحسنی صاحب ندوی کا مرتب فرمودہ مستقبل کے لئے ندوہ کا ہمہ گیر منصوبہ انتہائی اہم دستاویز ہیں جن پر ملتِ اسلامیہ کو نہ صرف گہرا غور و فکر کرنا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے بہت جلد مستحکم اقدامات بھی کرنا ہیں۔ جہاں ہندوستان میں دینی نظامِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے جشنِ تعلیمی کے دوران بڑی حد تک … سامنے آئی ہیں وہیں ممالکِ اسلامیہ کے عام نظامِ تعلیم کے متعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے جو بروقت انتباہ اور رہنمائی فرمائی ہے، اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔ ہندوستانی مسلمان ہمیشہ عالمِ اسلامی کے لئے دردمند رہے ہیں اور خاص طور پر منبعِ اسلام سرزمینِ پاک عرب کے متعلق بہت حساس ہیں۔ ہم حجازِ مقدس کے اطراف میں جنوبی یمن اور صومالیہ کا حشر دیکھ چکے ہیں اور اس زہریلی تحریک کو سلطنتِ عمان کی حدود میں داخل ہوتا ہوا بھی دیکھ لیا ہے۔ نیز عراق و شام پر بھی اسکے اثرات پھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ دیگر عرب و اسلامی ممالک اس زہریلی تحریک کے جراثیم سے پاک و صاف نہیں ہیں۔ کاش وقت ہاتھ سے نکل جانے سے قبل مرکزِ اسلام یعنی مملکت سعودی عرب، سلطنتِ عمان، متحدہ عرب امارات، قطر، کویت، اردن اور دیگر عرب و اسلامی ممالک حضرت مولانا صاحب مدظلہ کے بروقت انتباہ پر فوراً ہوشیار ہو جائیں اور اپنے نظامِ تعلیم و تربیت کو یکسر تبدیل کر کے اپنی آنے والی نسل کو نظریۂ اسلامی کا علمبردار بنا کر عرب و اسلامی ممالک میں گمراہی کے طوفان کا مقابلہ کریں۔

مذکورہ بالا تمام تقاریر، مقالات اور مضامین کو ریکارڈ اور مرتب کرنا جتنا ضروری ہے اتنی ہی انکی نشر و اشاعت اہم ہے جسے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ "تعمیرِ حیات" اور "البعث الاسلامی" اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام بحسن و خوبی انجام دے لیں گے۔ امید ہے کہ اس اشاعتِ خاص سے متصل شماروں میں ان شاء اللہ تعالیٰ آپ جشنِ تعلیمی کے دیگر مقالات اور عربی و انگریزی تقاریر و مقالات کے ترجمے بھی ضرور شائع فرما دیں گے تاکہ ان مسلسل شماروں کی جلد بندی کروا کر ملت کے لئے نافع ترین نظامِ تعلیم کی اس رہبر کتاب کو محفوظ کیا جا سکے۔

"تعمیرِ حیات" کی یہ اشاعتِ خاص صوری اعتبار سے بھی حسین اور دیدہ زیب ہے۔ اتنی لاجواب کتابت اور اعلیٰ طباعت اب دیکھنے کو کہاں ملتی ہے؟ ان تمام خوبیوں کے ساتھ … قیمتی اور وقیع مضامین اور مقالات میں بعض مقامات پر کتابت کی معمولی غلطیاں بڑی بار گذریں۔ چند ربط اور سرخیوں اور صفحات کی ترتیب بھی بدل گئی ہے۔ اگر پروف ریڈنگ پر اور زیادہ توجہ فرمائی جائے تو ہمارا یہ بلند پایہ علمی رسالہ ان معمولی خامیوں سے بھی پاک رہے۔ اس نشاندہی کو آپ تنقید یا تنقیص نہ خیال فرمائیے گا۔ یہ اشاعتِ خاص اتنی شاندار اور نافع ہے کہ اس معمولی خامی کی طرف خیال بھی نہیں جانا چاہیے تھا مگر میں نے بطور خیرخواہی کے اسکا ذکر کر دیا ہے۔ اس شاندار شمارہ کو مرتب کر کے سامنے پیش کرنے پر میں آپ کی اور آپکے معاونین کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

بسلسلۂ … مزید یہی آرزو اور التماس ہے … "تعمیرِ حیات" … کی اشاعت سے ایک سال کے لئے جاری فرما کر شکرگذاری کا موقع عنایت فرمائیں۔

امید ہے کہ بفضلہ مزاجِ گرامی بعافیت ہونگے۔ میں گذشتہ … سے علیل ہوں۔ یہ خط بحالتِ علالت ہی لکھ رہا ہوں۔ آپ کی دعاؤں کا طالب۔ والسلام

مخلص (نواب) محمد حامد علی خاں

(رسالہ … نواب و ریاست محمد گڑھ)

آنکھوں دیکھا حال

قاضی محمد عدیل عباسی

ندوہ کا ۸۵ سالہ جشن تعلیمی

(ندوۃ العلماء کے اجلاس پر قاضی محمد عدیل عباسی کا یہ تاثراتی مضمون ادب میں ترقی پسند اقدار کے ترجمان ماہنامہ "صبح ادب" لکھنؤ کے نومبر و دسمبر کے شمارے میں شائع ہوا تھا، ماہنامہ "صبح ادب" کے چیف ایڈیٹر مسعود الحسن صاحب عثمانی کے نوٹ کے ساتھ یہ قارئین تعمیر حیات کی خدمت میں پیش ہے۔

ماہنامہ "صبح ادب" کے مشاورتی بورڈ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، کوثر چاند پوری، عبد القوی دسنوی اور ڈاکٹر شارب ردولوی جیسے ادیب اور اردو ادب کے نقاد شریک ہیں) ۔

(ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اسلامی اور دینی تعلیمات کے علاوہ خالص اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اہل علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خود علامہ شبلی کا نام اس سلسلے میں کافی ہے جن کی شخصیت میں دین و ادب کا سنگم موجود تھا۔ ان کے بعد سید سلیمان ندوی کی شخصیت بھی اردو ادب کے افق پر درخشاں نظر آتی ہے۔ دار المصنفین کو جن شخصیتوں سے عروج نصیب ہوا ان سب کا تعلق ندوہ سے ہی تھا اور اردو ادب سے بھی ان کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی جو اپنے ذوق و مزاج کے لئے مشہور تھے ان کی وہ تحریریں جو اردو ادب و شاعری کے متعلق ہیں دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔ مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند اور اقبال کامل اردو کے ہر طالب علم کے مطالعہ میں رہتی ہیں۔ خود مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے ادبی مضامین اردو کے مشاہیر اہل قلم و اہل علم کے حلقہ میں شوق و ذوق سے پڑھے جاتے ہیں اور مولانا کے ادبی مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ادبی مضامین میں بھی مولانا اپنے ذوق و مزاج کے گوشے تلاش کرتے ہیں اور انہیں کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً "نقوش اقبال" کے تمام مضامین اسی طرح کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن بہرحال اقبال کے سلسلے میں اس گوشہ کو بھی اہمیت ہے بلکہ اسی گوشہ کے تحت دوسرے پہلو تلاش کئے جاتے ہیں۔ مولانا کی ایک تازہ تصنیف "پرانے چراغ" میں جگر مراد آبادی پر مضمون بھی اسی طرح کا ہے۔ جگر کی شاعری میں مولانا نے جو پہلو تلاش کر کے پیش کیا ہے وہ اگر مولانا پیش نہ کرتے تو ادبی دنیا کے سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ ندوہ کے اکابرین ہمیشہ اسلامی تعلیمات کے علاوہ ادبی تحقیق و تنقید پر بھی توجہ کرتے رہے ہیں اور ان کے ذریعہ اردو دنیا کو زبان و بیان کی خوبصورتی، رعنائی و دلآویزی ملتی رہی ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر اس جشن تعلیمی میں اردو ادب کے ممتاز اہل قلم حضرات بھی مدعو کئے گئے تھے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، شہاب الدین دسنوی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر عبد الحق اور دوسرے بہت سے لوگ موجود تھے۔ یہ سارے حضرات اسی قدر مشترک کی بنا پر تشریف لائے تھے جو ان کے اور ندوہ کے درمیان ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔

صبح ادب ایک ادبی رسالہ ہے اس میں اسلامی اور مذہبی مضامین شائع نہیں ہوتے لیکن ندوہ سے اس کا تعلق ان کا ہے ...

مکتوب مولانا محمد ناظم ندوی

صدیق مکرم حضرت مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی دامت فیوضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ندوۃ العلماء کے جشن تاسیسی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کا خطبۂ استقبالیہ کو ذوق و شوق سے پڑھا۔ آپ نے ... علماء دین کی خدمات اور ان کی اسلام سے وابستگی کے اخلاص اور جدوجہد کا ذکر جس دلکش اسلوب میں کیا ہے وہ داد و تحسین سے بلند و بالا ہے ... ندوۃ العلماء اور دار العلوم کے قیام کے مقاصد کو بیان کیا ہے وہ بھی ندوۃ العلماء کی تاریخ کا ایک جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت رکھے تاکہ آپ نہ صرف بھارت کے مسلمانوں کے لئے بلکہ عالم اسلام کے لئے کام کرتے رہیں۔

جشن کے انعقاد سے قبل تمام متعلقہ مضامین پمفلٹ وغیرہ مجھ کو ملتے رہے اور میں برابر ان کا مطالعہ کرتا رہا ...

[illegible]

ندوۃ العلماء کا ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی

(از: مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈا نگری (ناظم مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال)

مخدوم و مطاع الاسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ہندوستان کے ان مشاہیر و ممتاز عالموں میں سے ہیں جو اپنی اسلامی خدمات اور علمی تصنیفات پر دنیائے اسلام سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور اپنی عالمانہ بصیرت اور دینی خدمات کے سبب ایک مفکر کی حیثیت سے جانے و پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی علمی خدمات، اور معرکۃ الآراء تصنیفات نے تو مردہ قلوب میں طہارت و حرارت کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے۔ ان خدمات کے ماسوا ان کی ایک عظیم ملی خدمت دار العلوم ندوۃ العلماء جیسے علمی ادارے کی نظامت کے بھاری بوجھ کو سنبھال لیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ندوہ ان کے دورِ نظامت اور ان کی ایمانی زندگی کا ایک "زریں شاہکار" اور مولانا کے حسن انتظام اور اعلیٰ کارکردگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے یا یہی ندوہ نے اپنی عمر کے ۸۵ سال پورے کرنے کے بعد ایک تقریب ۸۵ سالہ تعلیمی جشن کے نام سے منائی۔

چونکہ مولانا علی میاں کی ذات گرامی کو ندوہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ندوہ تو ان کے اسم گرامی کا جزو لاینفک ہے، اس لئے میرے ان تخیلات کا مرکزی نقطہ مولانا علی میاں صاحب کی ذات اور ان کی شخصیت ہوگی۔

اس جشن میں عالم عرب کے بیشمار مہمانوں نے جس میں اونچے طبقے کے لوگ شامل تھے شرکت کی، اور انہوں نے اس جشن کی زینت کو چار چاند لگایا، بیرون ملک کے اتنے نمائندوں کا یہ عظیم اجتماع مولانا کی حد درجہ کشش اور پر اثر شخصیت کو اجاگر کرتا ہے، ورنہ فکر و نظر کا اختلاف تو اس قدر شدید تھا کہ یہ نمائندے شاید اپنے کسی عرب کانفرنس میں بھی اکٹھا ہو سکتے۔ ایک پلیٹ فارم پر مختلف نظریات کے حامل انسانوں کا جمع کر دینا یقیناً ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان معزز ہستیوں میں ازہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود الموقر اور امارات عربیہ متحدہ کے سکریٹری شیخ عبد اللہ العلی المحمود، ابوظبی کے چیف جسٹس الشیخ عبد العزیز آل مبارک المحترم شامل ہے ہیں۔ علاوہ ازیں کویت، قطر، دمشق، شام، عراق، اردن، ایران، روس اور بنگلہ دیش کے نمائندے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ اجلاس حضرت آپ ڈاکٹر عبد الحلیم محمود جیسے صاحب علم و فضل ہستی کی زیر صدارت منعقد ہوا اور جمعہ کے مبارک دن سے اس اجلاس کا افتتاح ہوا۔ ایک وسیع پنڈال ایک نہایت عظیم الشان اسٹیج اس کے لئے [illegible] پنڈال کو عروس نو کی طرح سجایا گیا تھا۔ پورے پنڈال میں سامعین کے لئے کرسیاں بچھا دی گئی تھیں اور کرسیوں کے بچھانے میں بڑی سلیقہ مندی کا ثبوت دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ مختلف اہل علم اور دیندار بادشاہوں کے نام کا گیٹ تیار کیا گیا تھا۔ اس اسٹیج کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تقریباً دو سو آدمی اسٹیج پر تشریف رکھتے تھے۔

اجلاس کا پہلا دن:

جمعہ کے مبارک دن سے اس اجلاس کا افتتاح ہوا اور نو بجے کارروائی عمل میں آئی۔ تلاوت قرآن پاک کے سحر آفریں آواز سے کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء کا ترانہ ہوا جو بہت جدید انداز میں نئے ڈھنگ سے پڑھا گیا۔ ترانہ بہت پر اثر اور مسحور کن رہا۔ اس کے بعد حضرت الاستاد مولانا علی میاں صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔

خطبۂ استقبالیہ ملت اسلامیہ کی اس سعی و کوشش کی ایک تاریخی دستاویز ہے جو اس نے شریعت اسلامیہ کے تحفظ اور دین اسلام کے بقا کی خاطر انجام دی ہیں اپنی زندگی، اپنے وقار، اپنے آبرو کو خطرے میں ڈال کر دین کی سربلندی کے لئے جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کہ اس ملک کے مسلمانوں کو دینی شعائر و ملی تہذیب اور اسلامی تعلیم ہر چیز سے زیادہ عزیز رہی ہے۔ ایک طرف انہوں نے مغربی تہذیب و افکار پر عمل جراحی کی اور ان کے نظر فریب و گمراہ کن تصورات کی دھجیاں اڑا دیں، اور ان کے باطل طلسموں کو توڑ کر اسلام کی صداقت کو اجاگر کیا، کبھی انتہائی سنجیدہ اور عالمانہ ڈھنگ سے ان کا تعاقب کیا اور کبھی طنز و مزاح کے پیرایہ بیان میں ان کی خوش فہمیوں کا پوسٹ مارٹم کیا اور دینی ثقافت و کلچر کو مجروح ہونے سے بچا لیا۔

تو دوسری طرف مسلمانوں میں سیاسی آثار چڑھاؤ کے سبب جو ذہنی و فکری اضمحلال پیدا ہوا اُسے دور کر کے مثبت تعمیری طرز فکر اور جذبۂ عمل کی اسپرٹ دے کر ان کو آگے بڑھایا۔ مسلمانوں کا یہ جذبۂ اسلامی اور دینی ذہنیت سے ان کا گہرا لگاؤ مختلف طریقوں سے جلوہ گر اور مختلف شکلوں میں نمایاں و اجاگر ہوا۔ یہ جذبہ کبھی تحریک خلافت کی شکل میں ابھرا اور کبھی [illegible] سامنے آیا اور کبھی [illegible] اداروں کے قیام کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

غرض ہر طرح کی قربانی دیکر اور ہر قسم کے ایثار کے جوہر دکھا کر ملت کے سفینے کو غرق ہونے سے بچایا۔

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، ہر گام پر، ہر گام پر سنبھلا کئے

بہرحال دینی تعلیم اور اسلامی تحریک کن کن منزلوں اور کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گزری ہے اور ہندوستان کے علماء حق نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں اس کی مفصل رپورٹ مولانا کے قلم گوہر بار نے بڑے تفصیل سے درج کی ہے۔

اس کے بعد پھر اسی خطبہ کو عربی میں پڑھا گیا اور اس کے بعد شیخ الازہر کی عربی زبان میں ایک پر مغز تقریر ہوئی جو خطبۂ استقبالیہ کے جواب میں تھی، پھر جمعہ کی اذان ہوئی، خطبۂ جمعہ بھی انہیں شیخ صاحب موصوف نے دیا جو اگرچہ قدرے طویل ہوگیا تھا لیکن انتہائی پر سوز اور دینی ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔

تعلیمی نمائش گاہ:

یہ نمائش اپنی نوعیت کی واحد نمائش تھی ایک طرف تو اہل ندوہ کے ذوقِ جمال اور سلیقہ مندی کو اجاگر کر رہی تھی تو دوسری طرف ان کی جفاکشی و عرق ریزی کو گواہی دے رہی تھی۔

ہندوستان کے نامور مفسرین، محدثین، مورخین، ادباء، شعراء، نقاد، اور نعت داں عبقری اشخاص، کثیر التصانیف حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ ہند کا تعارفی چارٹ، اور پھر چارٹز کے ساتھ اس کے میز پر متعلق کتابوں کا نمونہ کس قدر قابل تعریف و تحسین سے فزوں تر اہتمام تھا۔

اس نمائش سے نہ صرف علم و تعلیم کی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی بلکہ علوم و فنون کے منفی روزگار علماء و ماہرین فن کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ جزوی کوتاہیوں و خامیوں کے باوجود تعلیمی نمائش سے طبیعت بہت خوش ہوئی اور ہر ایک صاحب نظر نے اُسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

دوسرا دن:

دوسرے دن سنیچر کو بعد نماز صبح حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی ایک پر سوز تقریر ہوئی۔ مولانا اس دور کی ناگفتہ بہ [illegible] سے میاں کی مثالی اس دور میں [illegible] قیمت و دنائیت، اتباع سنت و جذبۂ [illegible] ایمانی فراست، تازگی فکر و جرأت، حقیقت پسندی و عملیت، قلب و نظر کی وسعت، پر زور خطابت یہ تمام زندہ جاوید صفات مولانا کی ذات میں یکساں جمع ہیں۔

اس تقریر میں مولانا نے شرک جلی اور شرک خفی کی کھل کر مذمت فرمائی اور بدعات سے بچنے کی بہت موثر ہدایت کی۔ مولانا نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں فرمایا کہ ہر ایک گناہ، مصیبت و ہلاکت کا سبب بنتا ہے لیکن ہر گناہ کی الگ الگ تاثیر و خاصیت ہوتی ہے جیسے زنا کا خاصہ کوڑھ ہے۔ سود کی خاصیت افلاس و تنگ دستی ہے۔ جھوٹ کا خاصہ نفاق پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح شرک انسانی زندگی کو گھن کی طرح کھا لیتی ہے جو انسان کے لئے موجب خسران و ندامت ہے۔ یہ گناہ آپ کی زندگی کے لئے زہر (POISON) کی حیثیت رکھتا ہے زہر کی خاصیت بھی تو الگ ہے بعض زہر ایسے ہیں کہ انہیں کھاتے ہی انسان فوراً ہلاک و برباد ہو جاتا ہے بعض کا اثر ہفتوں میں ہوتا ہے اور بعض کا اثر مہینوں میں ہوتا ہے۔ بالکل یہی حال آپ کے گناہوں کا ہے، جس قسم کا گناہ ہوگا اسی طرح اس کا اثر بھی انسانی زندگی پر مرتب ہوگا۔ اگر خدا کی رحمتوں اور اس کی پیدا کردہ نعمتوں کی ضرورت آپ کو ہے تو آپ کو ارتکاب گناہ سے بچنا ہوگا۔

مولانا کی تقریر بڑے موثر انداز میں ہوئی اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے ضمیر پر کوئی ہتھوڑا چل رہا ہے اور نور ایمان کی کوئی پر قوت کرن دل کو برما تی جا رہی ہے ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

درمیانی شب کی تقریر:

سنیچر کو دن بھر عربی پروگرام جاری رہا اور اس کے ٹرانسلیٹ (ترجمے) فاضلین ندوہ کرتے رہے جس میں عربی نمائندوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ تقریریں بہت اچھی رہی ہیں۔ ان پر تبصرہ کرنا طوالت کے سبب مناسب نہیں ہے البتہ مترجمین میں مولانا ضیاء الحسن ندوی کا ترجمہ بہت عمدہ ہوتا رہا۔ آواز انتہائی صاف، خبری اور منجھی ہوئی، الفاظ انتہائی شستہ اور ادائیگی حد درجہ برجستہ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ جو ان کی علمیت اور اعلیٰ صلاحیت، اور بہترین قابلیت کو اجاگر کر رہی تھی۔ عربی زبان و ادب پر اتنا عبور اور روانی تعبیر کی ادائیگی پر ایسی قدرت مولانا عبد الحمید رحمانی فاضل مدینہ یونیورسٹی کو چھوڑ کر کم لوگوں کو حاصل ہے۔

ان تقریروں کے دوران میں حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی آواز اُبھری جس میں مولانا نے فرمایا، ہم نے عرب کے ان تمام نمائندوں کو چندہ لینے کے لئے ہرگز نہیں بلایا ہے، ہمارا ان کا ایک بہت دینی رشتہ ہے یوں تو دنیا کے تمام مسلمان ہمارے بھائی ہیں، ہم سب کا احترام کرتے ہیں لیکن اہل عرب کا ایک ممتاز مقام ہے۔ اس سرزمین سے ہماری دینی عقیدت وابستہ ہے اس لئے ہم نے ان حضرات کو دعوت دی ہے کہ کچھ اپنے دل کی کہیں اور کچھ ان کی سنیں، چندہ ہمارا مقصد نہیں ہے، مدرسہ تو آپ کی سرزمین میں ہے آپ کی ذات سے اس کی مضبوطی و ساکھ قائم ہے، ہم آپ کے چار چار آنے آٹھ آٹھ آنے کی رسیدات سے مدرسہ چلا رہے ہیں، ہم آپ سے وابستہ اور آپ ہم سے وابستہ ہیں، وطن کے ایک ایک ذرّے ذرّے سے ہمیں گہرا انس ہے، ایک ایک فرد سے ہمیں دل لگاؤ ہے، ہم آپ سے جدا نہیں رہ سکتے۔

یہ تقریر بھی ایسی دلسوزی و دردمندی سے ہوئی کہ بے ساختہ مولانا کی طرف دل کھنچنے لگا، تسخیر قلب کی وافر دولت اللہ نے مولانا کے حصے میں ڈال دی ہے۔

کارروائی کا تیسرا دن:

آج اتوار کو بعد فجر کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب کا بیان ہوا، بولانا کی تقریروں پر تبصرہ کرنا گویا کہ سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے پھر طوالت کا بھی خوف ہے۔ بحمد اللہ مولانا کا بیان ایسا شستہ و منجھا ہوا ہوتا ہے کہ دلوں میں ایمان و یقین کی شمع فروزاں، اور قلب میں طہارت و حرارت کی ایک نوری کرن دوڑ پڑتی ہے خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر مولانا کے حسب حال ہے ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

آج دن میں ماہرین تعلیم اور دانشوران ملک نے عربی اور اردو میں اپنے اپنے مقالے پڑھے اور اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ مقالات میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا مقالہ بہت پسند آیا جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی جامع تھا، جو زبان بھی ایسی سلیس و شگفتہ تھی کہ ہر خاص و عام اُسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔

ان مقالہ خوانوں میں بعض بعض حضرات نے تو کافی لمبے مقالے پڑھے جو بوریت کا باعث ہوئے۔ اصلاً سیمینار کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سو پچاس بلکہ بیس پچیس پچاس اہل علم یکجا جمع ہوتے ہیں اور کسی موضوع پر تحریر تبادلہ خیال ہوتا ہے، مناقشہ کی نوبت آ جاتی ہے، اور وہ چیز صرف اہل علم کے زمرہ تک محدود ہوتی ہے لیکن ایسا مجمع جس میں کافی تعداد میں عوام ہوں ایسے مقالے ہرگز نہ پڑھے جائیں جو بوریت پیدا کرنے اور مجمع کو اکتا دینے کا سبب ہوں۔ ایسے اجتماعات میں تو حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی سلمہ اللہ طول حیاتہ و دسترادہ کی طرح انتہائی سادہ عام فہم انداز بیان اختیار کرنا چاہئے۔ جتنے بھی لوگوں نے مقالات پڑھے یا تقریریں کیں انہیں مولانا موصوف کی تقریر شاہکار کا درجہ رکھتی ہے (جس کا تذکرہ آئندہ سطور میں آ رہا ہے)۔

پروفیسر خسرو صاحب وائس چانسلر علیگڑھ یونیورسٹی کی تقریر اور زور بلاغت:

لمبا زندگا قد، گورا چٹا رنگ، نورانی آن بان کہ انسان کی نظر دیکھتے ہی سحر کر رہ جائے۔ آپ کی تقریر کیا ہوئی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دریائے فصاحت موجیں مار رہا ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

سمجھ میں صاف آ جائے فصاحت اس کو کہتے ہیں
اثر ہو سننے والوں پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

موصوف کی تقریر اس شعر کا مصداق کامل تھی۔ موصوف کی تقریر کا مرکزی نقطہ "تعلیم اور معاش" تھا۔ انہوں نے یہ تصور دیا کہ ایک بچہ جو اس دھرتی کے سینے پر جنم لیتا ہے۔ اُسے آخر اسی زمین پر رہنا اور بسنا ہے دنیا کے تقاضے اُسے اپنی طرف کھینچتے ہیں بلکہ اسی آغوش میں وہ پلے رکھتے ہیں جس سے اس کو کوئی نجات نہیں۔ اُسے اپنے بوڑھے والدین اور ننھے منے بھائی بہنوں کی بھی پرورش کرنی ہے۔ بیوی بچوں کی ذمہ داری اُسے سنبھالنی ہے، گھر گرہستی کا بوجھ بھی اُسے اٹھانا ہے۔ تو پھر اس کو ایسی تعلیم و تربیت کیوں دی جاتی ہے جو اس کے دنیاوی زندگی کے لئے کارآمد نہ ہوئے۔ ندوۃ العلماء سے نکلنے کے بعد وہ دنیا میں اپنے کو بے یار و مددگار و بے سہارا کیوں پاوے۔ جہاں آپ اُسے عبادت کا طریقہ سکھلاتے ہیں اور خدا سے اس کا رشتہ قائم کراتے ہیں وہاں اُسے زمین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لائق کیوں نہیں بناتے یہی تصور و مشورہ ہمیں اقبال نے اپنے فلسفہ میں دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

(؟) "ترکِ دنیا قوم کو اپنے نہ سکھلا نا کہیں"

انہوں نے کہا کہ عربی مدارس کے طلباء جب فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو دنیا کے کسی بھی شعبے میں کام کرنے کے لائق نہیں ہوتے جہاں ان کی کھپت کی جا سکے۔ نہ تو انہیں حساب و جغرافیہ آتا ہے اور نہ وہ سائنس کا کوئی علم رکھتے ہیں اور نہ انہیں معاشیات سیاسیات کی کوئی جانکاری ہوتی ہے۔ اس لئے ندوہ کے ارباب حل و عقد بالخصوص حضرت مولانا علی میاں صاحب کو بچوں کے مستقبل کی طرف نگاہ کرنی ضروری ہے۔ بہتر ہوگا کہ علوم جدیدہ اور سائنس ٹکنالوجی کے شعبے کھولے جائیں اور بچوں کے مستقبل کو روشن بنایا جائے۔

موصوف نے اپنی اس تقریر میں اہل ندوہ ہی سے مخاطب نہ تھے بلکہ وہ تمام زعماء و اربابِ مدارس عربیہ کو خطاب کر کے ان کے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کر رہے تھے۔ اس کے فوراً بعد ہی مولانا علی میاں صاحب نے اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ندوہ کو علامہ شبلیؒ نے قائم کیا تھا اور وہ علی گڑھ کے نظام تعلیم و نظم سے خوب واقف تھے انہوں نے جس طرح مناسب سمجھا تھا ہمیں ندوہ کا نصاب دیا تھا اور ہم انہیں کے بتائے ہوئے خطوط پر چل رہے ہیں لیکن اب آپ نے ہمیں جو مشورہ دیا ہے، انہیں بھی سمجھ رہا ہے ہم آئندہ اس پر غور کریں گے۔ حضرت مولانا نے چند جملوں میں مختصر و جامع مدلل جواب سے سب کو مطمئن کر دیا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کا بیان اور زورِ بیان:

جنہیں دیکھتے ہی مولانا ابو الکلام آزاد کی یاد تازہ ہو گئی۔ موصوف بالکل مولانا آزاد کے مصداق کامل (True Copy) ہیں اور فراست ایمانی کی جھلک چہرے سے عیاں ہے ؎

نشاں چہرے سے ظاہر تھے بزرگی کمالات کے
شرافت کے نجابت کے تقدس کے طہارت کے

ان تمام صفات کا جامع آج ہم کو "تعلیم اور اسلامی فکر" کا درس دے رہا تھا۔ لوگ دریا کو کوزے میں بند کرنا بولتے ہیں، لیکن مولانا نے تو سمندر کو کوزے میں بند کر دیا تھا۔ علی گڑھ تاریخ اور اس پر سیاسی اثرات اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور پھر اسی ضمن میں علی گڑھ، دیوبند، ندوہ، جامعہ ملیہ کے قیام کا پس منظر اس طرح اجاگر کیا کہ ہر شخص اس گوہر افشانی پر عش عش کر اٹھا۔

اخیر میں موصوف نے پروفیسر خسرو صاحب وائس چانسلر علی گڑھ کے تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ مولانا نے فرمایا کہ جو لوگ اس کو ٹیکنیکل کالج اور سائنسی لیبارٹری بنا دینا چاہتے ہیں وہ ندوہ کو صحیح مشورہ نہیں دے رہے ہیں۔ ابھی ہم نے اس کے قیام کا مقصد بتایا ہے اگر اس میں سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے کھولے جائیں اور اس میں ڈاکٹر اور انجینئر پیدا کئے جائیں جیسا کہ ہمارے بعض دوستوں کا مشورہ ہے تو ندوۃ العلماء کے قیام کا جو مقصد ہے وہ مجروح ہو کے رہ جائے گا اور وہی دینی ذہن و فکر جس کا یہ ادارہ علمبردار ہے مگر دینی کی روح اس ٹیکنالوجی کے شعبوں میں دب کر رہ جائے گی جو امت کے لئے ایک سانحہ کی بات ہوگی۔ برعکس علم کا خانہ نہیں البتہ جن لوگوں کو شوق ہو علوم جدیدہ میں مہارت تامہ کا تو ندوہ نے انہیں راستہ دکھا دیا ہے اب وہ ملک میں پھیلے ہوئے کالج اور یونیورسٹیوں کا رخ کریں ــــ ندوۃ العلماء اپنی نوعیت کی جو دینی خدمت انجام دے رہا ہے اُسے پورا کرتا رہے۔ ندوۃ العلماء زندہ باد!

مولانا نے بتایا کہ جب ندوہ اپنے ڈگر کو چھوڑ کر سائنس و ٹیکنالوجی کے پرپیچ وادیوں میں قدم رکھے گا تو انجینئر و ڈاکٹر اور سائنسداں ہمارے ہاتھ تو ضرور آ جائیں گے لیکن ہمیں جن خوبیوں کے علماء کی ضرورت ہے وہ ہم نہ پا سکیں گے، ہمیں انجینئر تو ضرور ملیں گے لیکن ایسے علماء کہاں ملیں گے جو خالص علمی زبان میں دوسری علاقائی زبانوں سے بھی واقف ہوں اور ان کے تبلیغات کا زخ کر سکیں اور اسلام کی نشر و اشاعت کا حق ادا کر سکیں۔

کارروائی کا چوتھا دن:

آج صبح بعد نماز فجر سنگ بنیاد کی تقریب تھی، دادا دینی پڑتی ہے مولانا علی میاں مدظلہ کے ذہن رسا کی کرشمہ سازی کی فی الحال اور پر ہجوم مشاغل کے باوجود ہر جگہ قلب و دماغ حاضر ہے۔ مسلسل خطبات، تقریروں اور مجالس کا تسلسل بجز تائید ایزدی اور امداد الٰہی کے اور کس کا کرشمہ ہے۔ پھر دوران تقریر میں کسی نہ کسی جاندار شعر کا اس طرح برجستہ لانا کہ تقریر ہو یا تو ہی گویا جواہر کندن بن جائے جیسے خطبۂ استقبالیہ کا یہ شعر ؎

گو نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

آپ نے ایک اعزاز کو ٹھکرا دیا تو ہزاروں طرف سے بفضل خدا آپ کی عزت افزائی ہوئی ہے ہزاروں لوگوں نے آپ کے عزائم و مقاصد کو سراہا ہے اور آپ کا ذکر جمیل کیا ہے۔ ذرا ماحول کو نگاہ میں رکھ کر اس شعر کو دوبارہ پڑھئے، کیا خوب شعر ہے ؎

گو نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

سنگ بنیاد کی تقریب سے فارغ ہو کر تو سب پنڈال میں پہنچے اور اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ آج کے اجلاس میں ندوہ کے معصوم جگر پاروں نے پھر "ترانۂ ندوہ" سنایا، اس کے بعد ایک دو تقریریں ہوئیں، اور اس کے بعد اجلاس میں پاس شدہ تجویزیں سنائی گئیں جس میں تعلیمی و ترقیاتی منصوبہ و تجویزوں کے علاوہ سرور کائنات کی ذات اقدس پر بنائی جانے والی فلم کی پر زور مذمت کی گئی اور سرور کائنات کی زندگی سے گہری عقیدت و والہانہ شیفتگی کا اظہار کیا گیا اور دلیل کی گئی کہ ایسی فلم کا بنانا بند کیا جائے۔

ایک تجویز بیت المقدس کی بازیابی کے لئے اور مسلمانوں اقتدار سے نجات کے لئے پرسوز پر اخلاص دعائیں مانگی گئیں۔ رب کریم اہل ندوہ کی دعاؤں کو قبول فرمائے اور ملت اسلامیہ کو سرخروئی عطا کرے۔

مولانا علی میاں مدظلہ کی الوداعی تقریر:

اس کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ نے الوداعی تقریر فرمائی جس میں مولانا نے جلال الدین [illegible] بھی فرمایا کہ میں کس کا شکریہ ادا کروں جن حضرات نے اس اجلاس میں حصہ لیا ہے اور اپنی مسرت کی ہے ان کا نام میرے شکریے سے بھی بالاتر ہے۔ میرے دل کے جو جذبات ہیں الفاظ اس کی ادائیگی سے قاصر ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے الفاظ شکریہ کا حق ادا نہ کر سکیں گے اور نام لے کر جو شکریہ ادا [illegible]